

کتابخانه جامعہ اسلامیہ

# طریق افکار

تصنیف

رینی ڈیکارٹ

ترجمہ

مولوی عبدالباری صاحب دہلوی

پروفیسر فلسفہ، کلیہ جامعہ عثمانیہ

۱۳۵۱ھ ۱۳۴۱ھ ۱۳۴۲ھ ۱۹۳۲ء

طریق افکار

# فہرست مضامین

## طریق اور تفکرات

صفحات ۲۰ تا ۲۱

۱ " "

۱۰ تا ۱۱ " "

۲۱ تا ۲۲ " "

۲۵ تا ۲۶ " "

۳۵ تا ۳۶ " "

۵۹ تا ۶۰ " "

۷۴ تا ۷۵ " "

۸۲ تا ۸۳ " "

۸۹ تا ۹۰ " "

۹۲ تا ۹۳ " "

۱۰۰ تا ۱۰۱ " "

۱۰۱ تا ۱۰۲ " "

۱۱۴ تا ۱۱۵ " "

۱۳۹ تا ۱۴۰ " "

۱۴۹ تا ۱۵۰ " "

۱۵۹ تا ۱۶۰ " "

۱۷۹ تا ۱۸۰ " "

مقدمہ  
دیباچہ مصنف

طریق : حصہ اول

" " حصہ دوم

" " حصہ سوم

" " حصہ چہارم

" " حصہ پنجم

" " حصہ ششم

تفکرات : خدمت اقدس علماء شیعہ و عہدات میں صفحات ۸۲ تا ۸۳

" " مصنف کی گزارش

" " تفکرات سید کا خلاصہ

تفکرات متعلق فلسفہ اولیٰ جن میں وجود خدا اور روح جسم کے مابین فرق کو ثابت کیا گیا ہے۔

تفکر اول : ان چیزوں کا بیان جن میں شک کیا جاسکتا ہے۔ صفحات ۱۰۰ تا ۱۰۱

" دوم : انسانی ذہن کی حقیقت اور جسم کی نسبت اس کا آسانی سے جان سکتا ہے۔ ۱۱۴ تا ۱۱۵

" سوم : خدا کا وجود۔ ۱۳۹ تا ۱۴۰

" چہارم : صحیح اور غلط۔ ۱۴۹ تا ۱۵۰

" پنجم : مادی اشیا کی باہمیت اور وجود خدا کا ثبوت۔ ۱۵۹ تا ۱۶۰

" ششم : مادی اشیا کا وجود اور انسان کے جسم و نفس میں فرق۔ ۱۷۹ تا ۱۸۰

میر تقی و تنکری

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## مقدمہ

مشہور اریٹائی ناٹیکنی کی وفات کے ۴ سال بعد ۱۵۹۶ء میں رینی  
ڈیکارٹ پیدا ہوا۔ اس نے شک کو سب سے پہلے باقاعدہ صورت میں  
پیش کیا، اور سب سے پہلے اس سے تخریب نہیں، بلکہ تعمیر کا کام لیا۔  
یہ ٹورنی کے ایک شریف گھرانے کا بچہ تھا اور بچپن ہی سے ایک غیر معمولی  
ذہانت و طباعی کے آثار نمایاں تھے۔ اس کا باپ بیمار سے اس کو اپنا  
تھنا فلسفی کہا کرتا تھا، کیونکہ یہ ہمیشہ اور ہر شے کی نسبت کیا اور کیوں کے  
سوالات کرتا ہی رہتا تھا۔ صحت کمزور تھی۔ اس لیے آٹھ سال کے سن  
تک بڑھنے لکھنے کا اس پر زیادہ بار نہیں ڈالا گیا، اور ذہن سے زیادہ  
اس کے جسم کا خیال رکھا جاتا تھا، لیکن یہ بیمار بچہ جس کی موت کا ڈاکٹروں  
نے قوی دے رکھا تھا، گو بوڑھا ہو کر مرنے کے لیے نہیں آیا تھا، تاہم  
اسی زندگی اس کی ضرورت تھی، کہ فلسفہ میں انقلاب برپا کر دے، اور فکر کا  
ایک نیا دور قائم کر جائے۔ یہ حکمت و ریاضی کے بڑے بڑے معاصرین  
سے اگر تہذیبیہ نہیں، تو ان کا ہم پایہ ضرور تھا۔  
آٹھ برس کے سن میں ڈیکارٹ کو لاطینی کے نئے کالج میں داخل  
کیا گیا۔ یہاں کے ریکٹر کی عنایتوں نے اس کو اپنے ساتھ طلبہ سے  
زیادہ اڑا دی دے رکھی تھی، خصوصاً صبح پڑھنے کے معاملہ میں  
ان عنایات کا بڑا سبب اس کی صحت کا خیال تھا لیکن بعد کو صبح پڑھنے  
رہنے کی یہ عادت عمر بھر قائم رہی۔ وہ صبح کے ان گھنٹوں کو محض سو کر  
صبح نہیں کرتا تھا، بلکہ غور و فکر کے اس عالم میں پڑا رہتا تھا جس کے



کارناموں نے آگے چل کر اس کو حکماء و فلاسفہ کی پہلی صف میں بکھڑا کر دیا۔ کم از کم اس کے خاص سوانح نگار سبکیٹہ کی یہی رائے ہے اور بالکل درست ہے۔

سارٹھ آٹھ سال یہ عیسوی فرقہ والوں میں رہ کر غیر معمولی قابلیت کے ساتھ، زبان تارکچ، ریاضی، فلسفہ اور دینیات کی تحصیل میں مصروف رہا، شاعری اور ریاضیات سے اس کو خاص ذوق تھا۔ لیکن یہ علوم باوجود اپنی وسعت کے اس کی تشنگی نہ کر سکے، نہ ان سے "زندگی کی مفید چیزوں کا کوئی واضح و قطعی علم" حاصل ہو سکا۔ سارا انصاف ختم کر جانے اور باہنا بطہ عالم بن جانے کے بعد بھی، اس کو خود اپنے پہل کے روز افزوں علم کے سوا مشکل ہی اسے کچھ ہاتھ آیا۔ جیسا کہ وہ اپنی بے نظیر خود نوشت سوانح عمری، کتاب طریقہ دینی صحیح طریق استدلال، میں لکھتا ہے۔

اس کتاب کے پہلے حصہ میں تو وہ ان علوم پر گفتگو کرتا ہے جن پر لاقلمیت ہیں اس کی توجہ مبذول رہی، اور اس کے ذہن پر ان کا جو کچھ اثر پڑا، نیز اس امر کا کہ اساتذہ و معلمین کے پنچے سے نکلنے کے بعد اس نے ان علوم کو کیوں خیر باد کہا۔ اور بطور خود از سر نو تحقیق کا کیوں ارادہ کیا۔

"اس بہتہ کے ساتھ کہ میں صرف اس علم کو حاصل کروں گا، جس کو خود اپنے اندر یا کائنات کی عظیم الشان کتاب میں پاسکوں، میں نے اپنے شباب کا باقی حصہ سبھا لیا، درباروں اور فوجوں میں مختلف طبائع اور حالات کے لوگوں سے ملنے جلنے میں، مختلف تجربات کے جمع کرنے میں، خود اپنے کو مختلف حالات کے اندر جانچنے میں، اور سب سے زیادہ ان چیزوں پر غور و فکر میں صرف کیا، جو کسی فائدہ بھال صورت میں میرے سامنے آ جاتی تھیں۔ کیونکہ میرے نزدیک جس استدلال کو سر آدمی خود اپنے معاملات میں استعمال کرتا ہے اور جس میں غلطی کی فوراً ہی سترال جاتی ہے، اس میں مجھ کو ان استدالات کی نسبت بہت زیادہ صداقت مل سکتی تھی جن کو علماء اپنی ایسی تحقیقات میں استعمال کرتے ہیں، جس کا نہ کوئی اثر ہوتا ہے نہ نتیجہ، سوا اس کے کہ

ان سے اتنا ہی زیادہ غرور پیدا ہو جاتا ہے جتنا کہ ایسی تحقیقات معمولی  
فہم سے دور ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ جتنی زیادہ غیر معمولی ہوگی اتنی ہی زیادہ  
طبعی و ذہانت خرچ کرنا پڑے گی اور سیرے اندر حق و باطل میں  
تمیز کی خواہش ہمیشہ سے نہایت زبردست تھی تاکہ میں اپنے افعال  
کو اچھی طرح روشنی میں دیکھ سکوں اور اس زندگی میں یقین کے ساتھ

چل سکوں۔<sup>۱۲</sup> لاٹیش کو اس نے ۱۹۱۳ء میں چھوڑا اور ۱۹۱۴ء میں پیرس گیا،

ایک سال کا نوجوان، جو اپنے دیہاتی گھر اور کالج سے نیا نیا باہر آیا ہو،  
اور پائے تخت کو پہلے پہل دیکھا ہو۔ اس سے جس خوش وقتی اور  
سیر و تماشا کی توقع ہو سکتی تھی۔ اس میں مصروف رہا۔ لیکن زیادہ  
غریب تک نہیں۔ قادر مرہنی، جس سے لاٹیش ہی میں اس کی واقفیت  
تھی اور مشہور ریاضی دان تائیڈور کی صحبتوں میں، اس کو اپنے  
بے فکرے خوش وقت ساتھیوں سے زیادہ لطف ملنے لگا۔ ان دونوں  
کے ساتھ تعلقات نے اندر ایک نئی امنگ پیدا کر دی، سیر و تماشا  
سب بھول گیا، اور دو سال تک مسلسل ریاضیات میں لگا رہا۔  
اپنے جس کے مطالعہ اور سیر سیاحت کے ذوق نے

۱۹۱۴ء میں اس کو لٹاؤ کے شہر اوہ مارٹس کی فوج میں شرکت پر  
آمادہ کر دیا۔ یہ شرکت اس زمانہ کے نوجوان فرانسیسی شریف زادوں کے  
عام دستور کے مطابق محض رضا کارانہ اور خود اپنے مصارف سے تھی  
شہر اوہ کا لشکر ان دنوں پر پڑا میں تھا۔ جہاں ڈیکارٹ دو سال تک  
رہا۔ مگر اس اثناء میں کوئی جنگ نہیں پیش آئی۔ یہ پڑھنے ہی لکھنے میں  
مشغول رہا۔

شہر اوہ کی ملازمت ترک کر کے بویریا کے ڈیوک کی ملازمت  
کر لی کچھ دنوں حیدر سنی کی سیر کرتا رہا اور پھر لوئی لوئی برگ کی سرمایہ  
چھانڈنی میں اقامت اختیار کر لی۔ کتاب طریق کے دوسرے حصہ میں

زندگی کے اسی دور کا ذکر ہے، جو دراصل اس کی زندگی کا نہایت اہم دور ہے۔ یہاں وہ تمام پریشانیوں اور کسیر و تماشوں سے الگ ہو کر بس ایک گرم کمرہ میں بند، پوری آزادی کے ساتھ اپنے عالم خیال میں محو رہتا تھا۔ غور و فکر کے لیے یہ حالات جیسے کچھ موافق تھے، ان سے اس نے پورا نفع اٹھایا، اور ذہن کو تمام ان تفصیلات و موانع سے خالی کر کے جو مجتہدانہ فکر میں حائل ہوتے ہیں، تحقیق کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ چونکہ ہم شروع ہی سے عادت اپنی خواہشوں اور استادوں کے تابع ہوتے ہیں، جن میں اکثر تضاد ہوتا ہے، اس لیے یہ قریباً ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہمارے نیلے اتنے خالص و سنجیدہ رہ سکیں۔ چنانچہ کسی دوسری شے کی رہنمائی سے الگ رہ کر تنہا اپنی عقل کے استعمال کی صورت میں ہوتے۔ لہذا اس نے سوچا کہ بہترین صورت یہ ہوگی کہ جن باتوں کو اب تک مانتا چلا آیا ہوں، ان سب سے قطع نظر کر لوں، اور از سر نو ذاتی تحقیق کے بعد جو کچھ عقل میں آئے اسی کو قبول کروں، پرانی بنیادوں، یعنی بلا تحقیق سلسلہ اصول پر عمارت کھڑی کرنے سے یہ طریقہ اولیٰ ہے۔ غرض اس کا مقصد یہ تھا، کہ ”ذہن جن چیزوں کو جانتے کے قابل ہے ان کے علم کا صحیح طریقہ دریافت کرے“ اسی دریافت کے لیے اس نے وہ قواعد اربعہ وضع کئے جو سادگی کے باوجود دراصل اس کے عظیم الشان طریق کی بنیاد ہیں اس کے بعد اس نے چند پیش بندیاں بھی ایسی کر لیں، کہ پرانے خیالات کے ترک کا کہیں یہ حشر نہ ہو، کہ سرے سے عمل ہی باطل ہو جائے یا تنزل و تذبذب میں پھنس کر رہ جائے۔ یہ سب کتاب طریق کے دوسرے اور تیسرے حصہ میں مذکور ہے۔

ڈیکارٹ کی یہ تحقیق بھی نوئی برگ ہی کا کارنامہ تھی، کہ منہ سے مسائل کو انجبرہ سے حل کیا جاسکتا ہے اس نے خود لکھا ہے کہ اس تحقیق سے جن بے شمار نتائج کو وہ سامنے دیکھ رہا تھا، انھوں نے بے طرح

اس کو بے چین کر رکھا تھا۔ اس کے دوست چارلٹ سفیر نے اس کی لوح  
قبر پر جو کچھ لکھا ہے، اس کے یہ الفاظ قابلِ اعتبار ہیں، کہ اسرار  
فطرت کو تو انہیں ریاضی سے ملا کر اس نے یہ مروانہ اسید باندھی تھی، کہ  
دونوں کے راز ایک ہی گنجی سے کھل سکتے ہیں۔

اس محققانہ کارنامہ کی تاریخ ۱۹ نومبر ۱۹۰۷ء ہے جس کے ضمن  
میں اس نے تین خواب دیکھے۔ وہیں تو اس کو اپنی زندگی میں تبدیلی  
پیدا کرنے کے لیے تنبیہ تھی، اور تبصیر خود اس کی تعمیر کی رو سے اس  
جانب اشارہ تھا، کہ روح صداقت جو ان خوابوں میں آئی تھی۔  
علم کے تمام خزانوں کو اس پر کھول دینا چاہتی ہے۔ انہی خوابوں  
کے سلسلہ میں اس نے لورینو کی درگاہ پر حاضری کی نذر مانی۔ تاکہ  
آئندہ کام میں اعانت کا طالب ہو اور اس نذر کو پورا کیا۔  
ڈیکارٹ کا مذہب کے متعلق واقعی کیا خیال تھا، چونکہ اس  
میں لوگوں کا اختلاف ہے، اس لیے اتنا کہہ دینا بے محل نہ ہو گا، کہ وہ  
قدرت سے جیسا کچھ آزاد و مجتہدانہ داغ لے کر آیا تھا، ظاہر ہے۔  
لیکن و بنیات کو اس نے اپنے اجتہاد سے الگ رکھا یہ جان کر کہ الہامی  
صداقتیں ہماری نہم سے بالآخر ہیں، اس نے بقول خود ان کو اپنے  
کمزور استدلالوں کے حوالے کرنے کی جرات نہیں کی وہ سمجھتا تھا کہ ان  
کی کامیاب تحقیق کے لیے غیر معمولی آسمانی اعانت درکار ہے، اور  
آدمی کو آدمی سے کچھ زیادہ ہونے کی ضرورت ہے۔

ابھی تک حکمت (سائنس) کی بے دینیوں کا بادل سمندر سے  
پوری طرح نہیں اٹھا تھا، اور ڈیکارٹ کا یہ اصول کہ کسی بات کو  
بلا تحقیق اور دوسرے کی سند پر نہ قبول کرنا چاہئے، اس امر کے منافی  
نہ تھا، کہ الہامی حقائق، اس سے مستثنیٰ ہیں اس کی تعلیم عیسوی آیات نے  
کی تھی، اور جب پہلے پہل اس نے شک کا اصول قائم کیا تھا، یہ بالکل  
محکم بلکہ قدرتی امر تھا، کہ اسی وقت مذہبی حقائق کو اس نے تحقیق کے

دائرہ سے باہر رکھا ہو۔ البتہ آجکل کوئی شے بھی تحقیق کے دائرہ سے خارج نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن اس وقت تک ایسا نہ تھا، اور گو یہ نیا اصول خود ڈیکارٹ ہی کا تھا تاہم یہ نہیں لائرم آتا کہ اس سے اپنی انتہائی حد تک اس کو پہنچا دیا تھا۔ لہذا ڈیکارٹ پر مذہبی انتہا سمیت کا الزام لگائے ہیں ہم جلد باڑی سے کام نہیں لے سکتے، اور اگرچہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ ہمیں وقت وہ اپنے اذعانات کو اپنے زمانہ کی دنیا سے مخالف پاتا تھا۔ پھر بھی دعویٰ کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا، کہ وہ ان دونوں کو باہم ناقابل تطبیق کہاں تک خیال کرتا تھا۔ نہ سوائے کہ اس منقسم خاکہ میں، ایک طرف اس کو پکا مذہبی اور دوسری طرف انتہائی سمجھنے والوں کے دلائل صحیح طور سے بیان کئے جاسکتے ہیں۔ البتہ کتاب طریق سے انتہائی چلتا ہے کہ بالفعل ڈیکارٹ کا اصول اس مذہب کے تو مطابق ہی ہے، جس میں اس نے خدا کے فضل سے تعلیم پائی ہے اور جس طرح اس اصول پر وہ مرتے دم تک قائم رہا، اسی طرح کا ٹولیکی مذہب بھی اس کی زندگی کے ساتھ رہا۔

اس کے بعد کے چند سالوں کی سوانحی تفصیل غیر ضروری ہے، صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ سال ۱۶۲۹ء میں پوریا کے ڈیوک کی فوج میں وہ یومیس میں تھا، اور اگلے سال منگوری میں کوئٹہ جو کو الی فوج میں۔ کوئٹہ جو کو کے مرتے پر ڈیکارٹ فوج سے الگ ہو گیا اور جرمنی ہالینڈ، اٹلی میں سیاحت کرتا رہا۔ اس سیاحت کے اختتام میں وہ مرتبہ چپ دن کے لیے گھر بھی گیا۔ گھر کے اسی جانے میں باب سے اپنی ماں کی وراثت کا جو حصہ پہنچا تھا وہ بھی لیا جس کو بعد میں بیچ بھی ڈالا

سہ شاید محقق مقدمہ نویس کے نزدیک اس آجکل میں انتہادیت کا نتیجہ اور لا اوریت کی بچا رگی داخل نہیں یا شمسائیں کے بادل اس قدر تاریکی بڑھا چکے ہیں کہ اب انسان بجلی کی دہری بھی شیک سے بھی اندھا ہو گیا ہے۔ مترجم



مال اس کے بچپن ہی میں مر چکی تھی۔ اس سیاحت وغیرہ کے بعد تین سال تک وہ پیرس میں مقیم رہا۔ یہاں اس نے اپنا وقت سائنس میں صرف کیا، جس میں علم مناظر و مرایا کا مطالعہ اور دوربین وغیرہ کے شیشوں کی صنعتگری بھی شامل تھی لیکن پیرس کی زندگی فلسفیانہ عزت پسندی کے مناسب نہ سمجھتی، دوست احباب برابر محل ہوسٹے رہتے تھے۔ اور ریاضیاتی وانی کی شہرت پہلے ہی سے قدر والوں کی آمدورفت کا باعث تھی۔ جان بچانے کے لیے اکثر قیام گاہ سے چھپکر کسی دوسری جگہ چلا جاتا، لیکن اخفا کی یہ کوششیں ناکام رہتیں، اور لوگ ہر گوشہ سے ڈھونڈ نکالتے۔ بالآخر جب اس کو بالخصوص ہوئی اور کہیں پناہ نہ ملی تو روسٹیل کے محاصرہ میں چلا گیا جہاں فوجی انجینیری سے کام لیا گیا تھا، جس سے اس کو دلچسپی تھی۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنی خدمات رضا کار کی حیثیت سے پیش کر دیں۔ لیکن روسٹیل میں بادشاہ کے داخل ہوتے ہی

یہ پیرس لوٹ آیا۔ پیرس کو چھوڑ کر کسی زیادہ گوشہ عافیت کی طرف بھاگنے کے مقصد اسباب جمع ہو گئے تھے۔ پڑھنا لکھنا جس کو اس نے اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیا تھا، اسی میں یہاں جو ناگزیر موانع اور فرامیتیں پیش آتی رہتی تھیں، ان کے علاوہ گرم آب و ہوا بھی مزاج کے ناموافق تھی، کارڈنل پیرونی کی یہ نصیحت و ترغیب بھی کہ اس کو اپنی قابلیتوں کو کام میں لانا چاہیے، گوشہ گیری کے غم میں مصیبت ہوئی۔ لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ ورٹیل یہ اپنے کو کلیسیا کی گرفت سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ کلیسیا سے روم اور اس کا فخر و احتساب نئی باتوں کا دشمن تھا۔ مثلاً حال ہی میں حرکت ارض کا نظریہ زندگی کا موجب کھڑا تھا، اور اس کا معلم کلیڈ ستر کا مستوجب ہو چکا تھا۔ ڈکارٹ نے غالباً پہلے ہی سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کے خیالات اور کائنات بینی مذہب کے رسمی اعتقاد میں خاصی نہ کسی دن تصادم کا اندیشہ ہے۔ اب خواہ کلیسیا کے

معتقدات کی عزت یا اس کے مظالم کے خوف کی بنا پر ڈیکارٹ نے بہر حال یہ بہتر جانا کہ کسی ایسی جگہ چلا جائے، جہاں بلا سبب و تہمت اسے اپنے مطالعہ کو جاری رکھ سکے لیکن جس آزادی کی امید میں یہ فرانس کی کاٹولیکی سرزمین کو چھوڑ کر ہالینڈ کے احتجاجی (ریپبلٹنٹ) ملک میں بھاگا تھا، وہ وہاں بھی نصیب نہ ہوئی۔

بہر کیف اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کا ڈیکارٹ نے تہیہ کر لیا۔ قارئین کو پیرس میں اپنا کارپردار اور مراسلہ نگار مقرر کیا، ایسے ریکو کے ہاتھ میں سب کا رویا رویا، دو ایک خاص احباب کے علاوہ باقی دوستوں سے محض خط لکھ کر رخصت ہو لیا اور اتنا موقع دے بغیر کہ وہ اپنی ترغیب و ترہیب یا تاسف سے اس کو روک سکیں، ۱۶۲۸ء کے خاتمہ پر پیرس سے چل کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے وہ کہاں گیا، یہ نہیں معلوم۔ البتہ یہ خیال ہوتا ہے کہ شمالی فرانس کا کوئی ایسا دور افتادہ مقام ہوگا، جہاں کی اب وہاں، اس کو ہالینڈ کے زیادہ سخت موسم کا کچھ عادی بنا سکتی ہو۔ کیونکہ اصل ارادہ اس کا ہالینڈ کا تھا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہاں کسی سے اس کی واقفیت نہ تھی، گو اور دوسری وجہیں اگر نہ شریک ہوتیں، تو وہ طبعاً اٹلی جانا زیادہ پسند کرتا۔

غرض ۱۶۲۹ء میں وہ (امیگرڈم) میں اقامت گزیں ہو گیا۔ لیکن ہالینڈ کے اس سارے زمانہ قیام میں وہ ادھر ادھر کھرتا ہی رہا، چند مہینے یہاں، چند مہینے وہاں۔ مگر اصل مقصد اپنے پڑھنا لکھنا ہمیشہ سانسے رہا اس لیے پیل جوں سے برابر بھاگتا رہا۔ اسی کے لیے بڑی بڑی تدبیریں کرتا رہتا، کہ کسی کو اس کا پتہ نہ لگے۔ مثلاً اپنے خطوط براہ راست نہیں منگاتا تھا، اور جو خود لکھتا تھا، ان پر ایسے مقام کی تاریخ ہوتی تھی، جہاں یہ نہیں ہوتا تھا، اس اختیاری جلاوطنی سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مقصد کے ساتھ اس کو کیا اہمک و عشق تھا، گو وہ اپنے اصل کام کی خاطر سب کچھ پیچھے ڈال دیتا تھا، تاہم انجانے جس سے متنفذ یا بیرونی نہ تھا جیسا کہ ایک خط میں چارلٹ کو لکھتا ہے کہ اگرچہ میں انسانی عجائبات سے گہرا متا ہوں، کہ ان میں ہر قسم کی لغو باتوں اور بیہودگیوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے تاہم میرا ہمیشہ سے خیال ہے کہ

زندگی کی سب سے بڑی لذت، ایسے لوگوں سے گفتگو اور صحبت کا لطف ہے جس کی ہمارے دل میں عزت ہو، اور اس کے فلسفہ کی غرض تو غرض انسان کی فلاح و بہبود ہی تھی۔ دوستوں سے کہتے ہیں اس کو جو دشواری پیش آتی تھی اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ان میں ایک حد تک ہر دل عزیز تھا۔

بہت پرول غریز تھا۔  
 اس کی پائینڈ کی زندگی کا سارا حال ہم کو اس کی خط و کتابت سے  
 معلوم ہو جاتا ہے لیکن علمی حیثیت سے الگ سکر کے ان خطوں کی شخصی  
 حیثیت کسی قدر اس واقعہ سے کم ہو جاتی ہے، کہ یہ اشاعت کی  
 غرض سے کیے گئے تھے۔

قرض سے لئے گئے تھے۔  
 ڈیکارٹ بیس سال ہالینڈ میں رہا، اگرچہ جیسا کہ ہم بتا آئے  
 ہیں کسی ایک جگہ نہیں <sup>۱۶۳۳</sup>۱۶۳۳ء میں وہ ڈنمارک گیا <sup>۱۶۴۰</sup>۱۶۴۰ء اور  
<sup>۱۶۴۵</sup>۱۶۴۵ء میں فرانس گیا اور <sup>۱۶۴۹</sup>۱۶۴۹ء میں سویڈن کا سفر کیا ایک مرتبہ  
 اچھوتان آئے گا بھی خیال کیا اور گوپلیٹ کے نزدیک وہ آیا بھی مگر

اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، نہ اس کے خطوں میں ذکر ہے۔  
اس نے جو کچھ لکھا وہ قریباً سب کا سب ہالینڈ ہی کے زمانہ  
قیام میں لکھا۔ یہاں اس کے احباب بھی پیدا ہوئے۔ مباحثے اور  
مناظرے بھی رہے۔ خط و کتابت بھی بہت کی۔ مابعد الطبیعیات مناظر  
وہرایا، کیمیا، طب، تشریح اور ہیئت کا مطالعہ بھی کیا۔ تمام چیزوں کے  
مطالعہ میں وہ مشاہدہ و اختیار کو کتب بینی پر مقدم رکھتا تھا، اور اسی  
کی اس سے توقع بھی تھی۔ نباتاتی تحقیقات کے لیے وہ خود اپنے باغ  
میں نمونے کے درخت لگاتا تھا۔ حیوانی تحقیق کے لیے نذج جایا کرتا  
تھا اور گھر پر بھی جانوروں کے اعضا منگوا لیا کرتا تھا، کہ فرصت کے  
وقت ان کا امتحان کر سکے۔ خود بھی زندہ جانوروں کی چیر بھار کیا کرتا تھا،  
اور گروہ حیوانات کو جن میں انسان بھی شامل ہے، شخص خود حرکت  
آلات مانتا تھا، البتہ ادنی حیوانات انسان کی سعی عقلی روح نہیں رکھتے



تاہم اپنے بعض اتباع کی طرح، اس کا یہ انتہائی دعوائے نہ تھا کہ حیوانیت سے کوئی احساس ہی نہیں رکھتے، لہذا اس لیے بھی کے ساتھ ان کو حیرا بھاڑا جاسکتا ہے۔

ڈیکارٹ کو عزت کا جتنا اہتمام تھا، اتنی سمجھ کے ساتھ اس کا پابند نہ تھا۔ اس نے ہالینڈ کے فلاسفہ اور دیگر مشاہیر میں بہت سے دوست بنائے رکھے تھے، وہ اکثر فرانسیسی سفیر سے ملنے ہینک جا کر رہتا تھا۔ شہزادہ آرنج اور پولینڈ کے سابق پادشاہ کے درباریوں سے نہایت بے تکلفی کے تعلقات تھے۔ موسیو ویل بریسیول کسی سال تک اس کے ساتھ رہا، یہ ڈاکٹر تھا اور ریاضی اور کیمیا کا عالم اسکو ڈیکارٹ سے اس درجہ محبت تھی کہ ہالینڈ میں اس کے ساتھ رہنے کے لیے اپنے وطن فرانس کو چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ ڈیکارٹ نے اس کی محبت کا پورا حق ادا کیا، دونوں ساتھ ہی رہتے اور مل کر کام کرتے تھے، خصوصاً علم مناظر و مریا پر ویل بریسیول ہوشیار آدمی تھا، بعض چیزیں اس نے بالکل نئی ایجاد کی تھیں، مگر ہمیشہ کہتا رہتا تھا، کہ یہ سب میرے دوست کی تعلیم کا طفیل ہیں۔ ڈیکارٹ کو خود اپنے اجتہاد کا بہت خیال تھا اور شاذ ہی اس نے کبھی کسی کا اعتراف کیا ہے لیکن ویل بریسیول کی مثال میں معاملہ بالکل برعکس تھا۔ وہ ویل کا اتنا ہی فیاض معترف تھا جتنا ویل بریسیول خود اسی کا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ڈیکارٹ اپنے اس دوست کی تفریح خاطر کے لیے اکثر عجیب عجیب باتیں کرتا تھا، ان میں سب سے زیادہ عجیب و غریب سپاہیوں کا تماشہ ہوا کرتا تھا، جو یکایک ان کے کمرہ میں آجاتے، گزرے اور چلے جاتے یہ کرشمہ وہ آئینہ کی مدد سے کیا کرتا تھا، کھلونوں کے چند سپاہیوں کو چھپا کر ان کو آدمی کے قد کے برابر بڑھا دیتا۔

۱۶۴۳ء میں ڈیکارٹ نے، کائنات پر اپنی پوری سالانہ

اس کو ختم کیا، جو اس کی طبیعت کا خلاصہ ہے، اور ابھی اس کی اشاعت  
 کی فکر ہی میں تھا کہ یہ خبر ملی کہ گلیلیو کو درجہ سین سال پہلے اپنے  
 نظریہ حرکت ارض سے محکمہ احتساب کو مشغول کر چکا تھا۔ (قیس خانہ  
 بھیج دیا گیا، اور اس نظریہ سے حلفیہ دست برداری پر مجبور کیا گیا۔ دیکارٹ  
 نے اپنے رسالہ میں گلیلیو کے نظریہ کو ایک اہم مسئلہ اصول کی حیثیت سے  
 لیا تھا، اور سلسلہ استدلال کی اسی پر بنیاد رکھی تھی لہذا گلیلیو کی نسبت  
 کا یہ حال شکر اس نے اس رسالہ کو دبا ہی دیا۔ کیونکہ جو دلائل اس میں بیان  
 کئے گئے تھے، گو وہ اس کے نزدیک نہایت قطعی و بدیہی براہین پر مبنی ہیں، تاہم  
 کلیسا کے مقابلہ میں دنیا کی کسی شے کے لئے بھی ان کو نہیں مان سکتا۔  
 وہ کہتا ہے کہ کتابوں کی اشاعت کی بدولت ناپسندیدہ لوگوں سے جو  
 واقفیت ہو جاتی ہے، اس سے محفوظ رہ کر اس عزت کی زندگی گزارنے  
 میں مجھ کو جلدت ہے، وہ اس افسوس سے کہیں زیادہ ہے کہ رسالہ لہذا کو  
 کے لکھنے میں میرا وقت اور میری محنت رائیگاں گئی۔ تعجب ہوتا ہے کہ  
 پھر آخر اس کو لکھنے کی رحمت ہی کیوں ٹھانی تھی۔ بہر حال کم از کم یہ امکان ضرور  
 ہے کہ گلیلیو کی نسبت کا خوف بھی اس طرح اس رسالہ کو دبا دینے کا ذمہ دار  
 ہو سکتا ہے، جس طرح کلیسا کا احترام یا امن و عافیت کی محبت۔ اسی سلسلہ  
 میں بعد کے ایک خط میں سرینی کو لکھتا ہے کہ چونکہ میں کلیسا کی باتوں کو  
 ناممکن الخطافین کرتا ہوں، ساتھ ہی مجھ کو اپنے دلائل میں بھی شک نہیں  
 اس لئے کوئی اندیشہ نہیں کہ ایک صداقت دوسرے کے خلاف ہوگی نہ مجھ کو  
 اپنے فلسفہ میں کوئی ایسی شے تھی ہے جو عام فلسفہ سے زیادہ مذہب یا دینیات  
 کے مطالبات نہ ہو۔ بااں ہر یہ رسالہ اس کے مرنے سے پہلے شائع نہیں ہوا۔  
 آگے چل کر دیکارٹ نے اپنے اس تہیہ کو بدلیا کہ اس کی کوئی شے  
 شائع نہیں ہوتا جائے، اور ۱۶۳۷ء میں کتاب ”طریق تشریح ہمو کمی“

لے کتاب کا پورا نام یہ ہے ”مقتل کی صحیح رہنمائی اور علوم میں تلاش صداقت کے طریق پر بحث“

اس کے ساتھ بصیرات، تہباب اور ہندسہ پر مضامین جو اسی طریق کے استعمال کی کوششیں تھیں۔ ڈیکارٹ نے پہلے چاہا تھا کہ کتاب طریق فرانس میں کثرت شائع ہو، چنانچہ سرورق پر مصنف کا نام نہیں تھا لیکن سرسبی جس سے اس نے ضروری انتظامات میں مدد چاہی تھی، اس نے لونی سینر دہم سے نہ صرف اس کی اجازت حاصل کر لی تھی، کہ کتاب طریق کا مصنف جہاں اور جو کچھ چاہے شائع کر سکتا ہے، بلکہ متعدد دوستوں پر مصنف کے نام کا راز بھی کھول دیا تھا اور اس طرح غالباً نادانستہ گمنامی کے منصوبہ کو ختم کر دیا تھا۔ آخر کار کتاب لیدن میں شائع ہو گئی۔

ڈیکارٹ یہ جاننے کے لئے مجبور تھا کہ اس کی کتاب کا اہل علم پر کیا اثر پڑا۔ اس غرض سے اس نے فرانس کے بعض مشہور علماء کو اس کے نسخے بھیجے تھے، اور سب سے پیچیدگی کی درخواست کی تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کتاب طریق لوگوں کی کچھ زیادہ نگاہ میں نہیں آئی۔ لیکن اس کے پانچویں حصہ کے، جس میں ڈیکارٹ نے دورانِ خون کا نظریہ پیش کیا تھا۔ البتہ مضامین پر کثرت سے اعتراضات کئے گئے، جن میں سب سے اہم لوین کے ایک عیسوی سیرمانس اور فرانس کے علماء ریاضیات مورن، فرماٹ اور روبرواں کے تھے ان میں سے بعض کا جواب دے کر ڈیکارٹ نے ریاضیات کو ترک کر دینے کا اعلان کر دیا، ریاضیات سے اس کی مراد (خود اس کے الفاظ میں) تجریدی ہندسہ اور ایسے مباحث تھے جو محض طباعی ظاہر کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں اپنے کو ایک ایسے علم کے لئے وقف کر چکا ہوں، جس کے لئے ساری زندگی بھی خواہ وہ کتنی ہی طویل ہونا کافی ہے، لہذا ایسی چیزوں میں وقت ضائع کرنا حماقت ہوگی، جو میرے مفید مطلب نہ ہوں، اور یہ مباحث اسی قسم کے ہیں۔

اس اثناء میں ڈیکارٹ کی تعلیم کی طرف لوگ بھی کچھ متوجہ ہو چکے تھے

اور اس کے متبعین کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی تھی پہلے پہل جن لوگوں نے اس کی تعلیم کو قبول کیا، ان میں ایک رنیری تھا جس سے اس کی واقفیت ایسٹریڈاس کی پہلی آمد میں ہوئی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں رنیری اور شٹ کی نیو یورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر ہو گیا۔ جس کی بدولت اس کو ڈیکارٹ کی تعلیمات کے پھیلائے کا خوب موقع ملا۔ پانچ سال بعد یہ مر گیا، اور اس کی چھینر و کھین کے وقت نیو یورسٹی کی طرف سے جو تقریر کی گئی، وہ بقول ہیلٹ جتنی بروہ رنیری کی ستائش تھی اس سے کہ زندہ ڈیکارٹ کی مداحی نہ تھی۔ اس میں جس بات کی خاص طور پر تعریف کی گئی تھی، وہ یہ کہ رنیری نے فلسفہ میں سبذ و اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور انسانی عقل کو خدا کی عطا کردہ صداقت کی تلاش کے لئے آزاد کر دیا ظاہر ہے کہ یہ ڈیکارٹ ہی کے عظیم الشان طریق کا عکس تھا۔

ڈیکارٹ کی تعلیم کے اس اعتراف عام میں نیو یورسٹی کے ساتھ حکام بھی شریک ہو گئے اور رنیری کی یادگار اور ڈیکارٹ اور نئے فلسفے کے اعزاز میں اپنے حکم سے اس تقریر کی طبع و اشاعت کی اجازت بھی دیدی۔

یاد ہو کہ اوٹرشٹ کی نیو یورسٹی اس طرح گویا سرکاری طور پر ڈیکارٹ کی فلسفہ کی تعلیم گاہ ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے بعض اساتذہ اب بھی اپنی قدامت پرستی کی ہیٹ پر قائم رہے، اور پروفیسر وینیات سیرٹ فوٹسٹ کی سرکردگی میں، جو ۱۹۴۱ء میں رکٹر ہو گیا تھا، علمائے وینیات کی ایک پوری جماعت اس نئے فلسفہ پر رخصت میں دوران خون کا نظریہ بھی تھا، خطہ کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ فلسفہ احتجاجی مذہب اور امن سام دونوں کا دشمن تھا۔ ان کو نہ صرف ڈیکارٹ کی تعلیمات سے عداوت تھی، بلکہ خود اس کو گالیاں دیتے تھے۔ آخر کار یہ ان حکام تک کو بھر کا نیچے میں کامیاب ہو گئے جنہوں نے علانیہ ڈیکارٹ کے کارنامہ پر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

اور اب اسی ڈیکارٹ کو ایک دلیر انقلاب پسند اور مفرد اور غیر مقرر  
دیکر حاضری کا سہن جاری کر دیا اور اس کی کتابوں کی فروخت کو روک دیا  
دیا۔ لیکن قبل اس کے کہ جلاوٹ کے ہاتھوں اس کی کتابیں برسر عام نذر آتش  
ہوں ڈیکارٹ نے فرانسسی سفیر سے مرافعہ کیا اس کے اثر سے مجلس  
طبقات نے ایک حکم جاری کر دیا جس کی وجہ سے سر دست اس کے دشمنوں  
کی معاندانہ کوششیں رک گئیں۔ گو یہ آگ چار سال تک شعلہ زن رہی لیکن  
ڈیکارٹ کی تعلیم برابر آگے بڑھتی رہی اس کو نہ یہ محکمہ فنا کر سکا اور نہ لیدن  
کے فلاسفہ کا جو اس کے بعد ہوا۔

سال ۱۶۴۱ ڈیکارٹ نے اپنی کتاب "مابعد الطبیعیاتی تفکرات" پر  
شائع کی۔ اس پر بھی لوگوں نے اس لئے تنقید اور اعتراضات کی استدعا  
کی۔ اب کی مرتبہ اس کو کاتھریکس، ہابس، آرنالڈ اور گنڈی وغیرہ نے  
جوابات دیئے۔ ان سب کی تنقیدوں کا اس نے جواب دیا، لیکن کسی  
کا اعتراض اس کے دل میں اتر نہیں۔

اس کے بعد جو کتاب اس کی شائع ہوئی وہ "اصول فلسفہ" ہے  
یہ یو سییا کی شہزادی ایلزبتھ کے نام معنون تھی اور سال ۱۶۴۳ میں ایمپریٹرم  
سے نکلی۔ اسی سال ڈیکارٹ نے خانگی کام سے دو مرتبہ پیرس کا  
سفر کیا۔ لیکن قیام بہت مختصر رہا اور بالینڈا پس آکر نہایت محنت کے  
ساتھ تشریح کے مطالعہ میں لگ گیا۔ تین سال بعد اس پر لیسٹن کے  
علمائے دینیات نے حملہ کیا اس دفعہ بھی اس کو حکومت ہی کے واسطے  
میں پناہ لینا پڑی۔ شہزادی ایلزبتھ سے بھی اس کی بہت خط و کتابت  
رہی جو اس کی بڑی دوست اور نہایت عقیدت مند شاگرد بھی شہزادی  
بعد کو وینٹا لیا میں ہر روز دن کی بھگتن ہو گئی یہاں اس نے فلسفہ کی ایک

سے اردو میں خالی رد تفکرات "بہتر معلوم ہوتا تھا" اس لئے کتاب کا نام یہی  
کر دیا گیا۔ مترجم۔



اکاڈمی قائم کر دی، جس میں ہر فرقہ کے مرد و عورت سب داخل ہو سکتے تھے، اور اس کا شمار ڈیکارٹ کے مسلک کی پہلی تعلیم گاہوں

میں ہے۔ ایک اور شاہی خاندان کی عالمہ خاتون ہمارے فلسفی کی زندگی میں آتی ہے، یعنی ملکہ کرسٹینا اسی زمانے میں سویڈن کے تخت پر بیٹھی اور ڈیکارٹ کا دوست جانوٹ پہلے اسی کے ہاں ریڈنٹ اور پھر سفیر فرانس کی حیثیت سے تھا۔ یہ خاتون ہوشیار اور پڑھتے لکھنے والی خاتون تھی، جانوٹ نے چاہا کہ اس کو کسی طرح ڈیکارٹ سے واقف کر دے اس کی ترکیب یہ نکالی کہ محبت و نفرت کے متعلق ڈیکارٹ سے کچھ سوالات کئے، ملکہ کو اس بحث سے دلچسپی تھی، وہ ان کے جواب سے خوش ہوئی اور جانوٹ سے ڈیکارٹ کا حال پوچھا اور اسی کے ذریعہ تعلیم و توفیر کا یقین دلایا۔

خانگی معاملات کی وجہ سے ڈیکارٹ کو ایک دفعہ اور فرانس جانا پڑا۔ یہاں ابی اس کے علمی فضل و کمال کے اعتراف و اعانت میں تین ہزار لیور (پرانٹ فرانسیسی) کے قریب فرانک کے ہوتا تھا، کا وظیفہ پیش کیا گیا، جس کو اس نے قبول کر لیا۔ لیکن یہ وظیفہ ہالینڈ کی واپسی سے اس کو باز نہ رکھ سکا، جہاں واپس ہو کر وہ ”انسان پر اپنے رسالہ کی تیاری میں جو برسوں سے پیش نظر تھا، مصروف ہو گیا۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے، کہ دوبار فرانس لے اضافہ پیش کے ساتھ عہدہ دینے کا بھی وعدہ کیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وطن واپس آ جائے ڈیکارٹ نے قبول کر لیا اور پھر پیرس چلا گیا، مگر صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ فریڈ کی گڑبڑ نے فلسفہ کو کس پیرستی میں ڈال دیا تھا۔ یہ محسوس کر کے کہ پیرس کو اس کے وجود سے کوئی نفع نہیں، لوگ اس کو، جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے، ”پتھو پتھو“ کی طرح، محض ایک عجیب و غریب شے خیال کرتے ہیں، وہ آئین ہی مینے کے بعد ہالینڈ لوٹ آیا۔ یہاں اس کو ایک اور شاہی

دعوت ملی، لیکن ابھی یہ ملکہ کرسٹیا کی طرف سے تھی، جس نے اس کا فلسفہ پڑھنا شروع کیا تھا، اور چاہتی تھی کہ خود اسی سے پڑھے اس غرض کے لئے اس نے خاص طور پر ایک جہاز اور اسیر البحر کو بھیجا کہ جب آکر ڈیکارٹ کو اسٹاکھام لے آئے۔

اپنے تمام معاملات کو درست کر کے ڈیکارٹ فوراً سویدن روانہ ہو گیا، اور اکتوبر ۱۶۴۹ء میں اسٹاکھام پہنچ گیا۔ ملکہ نے اس کا نہایت ہی تیار سے استقبال کیا، اور چالوٹ کا کھڑا اس کے لئے کھلا ہی تھا۔ کرسٹیا کو فلسفہ کا اس قدر ذوق و شوق تھا، کہ اس نے تمام کاموں سے پہلے صبح سویرے ۵ بجے کا وقت پڑھنے کے لئے رکھا، پڑھنے کی جگہ شاہی کتب خانہ تجویز ہوئی۔ جنوب کی شدید سردی اور پھر ایسے ناواقف بیمار سے آرام طلب ڈیکارٹ کو ہفتہ میں دو تین بار حاضری دینا پڑتی تھی۔ وہ ایک علمی اکاڈمی بھی قائم کرنا چاہتی تھی۔ بار بار رات تک ڈیکارٹ سے اس کے معاملہ میں بھی صلاح و مشورہ کرتی رہتی تھی مزید بار غریب کی صحت پر یہ پڑا، کہ اسی زمانے میں چالوٹ بیمار پڑ گیا۔ جس کی خبر گیری وہ پوری تندہی سے کرتا تھا۔ عادت و اوقات کی یہ تبدیلیاں نئی اور سخت آب ہوا کا سامنا، نتیجہ یہ ہوا کہ خود بیمار پڑا اور سویدن میں قدم رکھے ابھی ۵ مہینے بھی نہ پورے ہوئے تھے کہ اجل نے آلیا۔

۵۴ سال کی عمر پا کر ۱۱ فروری ۱۶۵۰ء میں وفات پائی اور اسٹاکھام ہی میں دفن ہوا، لیکن ۱۶ سال بعد لاش کو وطن منتقل کر دیا گیا اور سینیٹ زنیو کو کے کلیسا واقع پیرس میں پھر داخل ہو گیا۔ حکمت اور ریاضی اور خاص کر فلسفہ میں ڈیکارٹ فرو تھا حکمت و ریاضی میں جو اکتشافات بعد کو ہوئے ان میں سے متعدد کو اس کی نظر نے پہلے ہی سے دیکھ لیا تھا، مثلاً رنگ کا نظریہ ارتعاش۔ باقی فلسفہ میں تو اس نے شک کے باقاعدہ استعمال سے اس کو فلسفہ کا آلہ کار

بنا کر انسانی خیال کی تاریخ کا ایک نیا دور ہی شروع کر دیا۔  
ڈیکارٹ کے نوشتہ حیات میں سب سے پہلی جو چیز موجود ہے  
وہ موسیقی پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔ جو اس نے بریڈا میں لکھا تھا مگر شائع  
اس کی موت سے پہلے نہیں ہوا۔ اور جس پہلی شے کی صرف تہادوت  
موجود ہے "وہ رسالہ سسٹائی فی ہے، جو کالج سے نکلتے ہی اس نے

لکھا تھا، مگر جس کا ہم کو اب فقط نام معلوم ہے۔  
اس کی زندگی میں جو کتاب سب سے پہلے شائع ہوئی وہ کتاب طریق  
ہے، جو فرانسیسی زبان میں تھی اور ۱۶۳۷ء میں لیڈن سے نکلی۔ اس کتاب  
سے معلوم ہوتا ہے، کہ ڈیکارٹ کس طرح تحقیق کائنات کے خیال پر آمادہ  
ہوا، اور کس طرح اس خیال کو تمام پامال راستوں سے بچایا، اور جہاں تک  
ممکن تھا محض عقل کی روشنی میں سب سے سیدھی راہ اختیار کی اس نے  
اپنی فکر کو تمام پرانے روایات بافتہ لباسوں سے برہنہ کر لیا، تعصبات  
کا بوجھل لہاؤہ اتار کر پھینک دیا، سند کے ڈر کو دل سے نکال دیا۔  
غرض اس طرح بغیر کسی خوف اور روک کے وہ عظیم الشان مسائل کے حل  
کی طرف بڑھا۔ اور یہی اس کا وہ مشہور کارنامہ تھا جس کا نام کتاب سب طریق  
ہے۔ باقی بصریات، شہاب اور ہندسہ پر جو مضامین اس نے اس طریق  
کو استعمال کر کے نئے مثالوں کے طور پر لکھے تھے، وہ اب فرسودہ  
ہو چکے ہیں۔ اسی ابن ود کو رسیل کے کتاب طریق اور ان مضامین  
(بجذات ہندسہ) کو لاطینی زبان کا لباس پہنا دیا تھا، جس کی نظر ثانی خود  
ڈیکارٹ نے کی تھی اور جو ۱۶۴۱ء میں "مثال فلسفہ" کے نام سے ایڈمرڈم  
میں شائع ہوئی تھی۔

"مابعد الطبیعیاتی تفکرات" پہلے پہل لاطینی ہی میں پیرس سے ۱۶۴۱ء  
میں شائع ہوئے۔ ڈیکارٹ اکثر فخر یہ کیا کرتا تھا کہ یہ تفکرات ایسی اہم حدائق  
پر مشتمل ہیں جن پر کبھی پہلے لوگوں کی نظر نہیں گئی اور جو سچے فلسفہ کا دروازہ  
ہیں جس کا اصلی کام جسم اور روح کے فرق کو دکھانا ہے یہ تفکرات



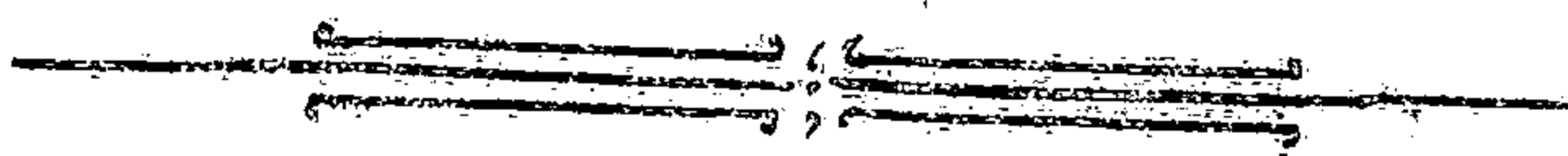
کتاب طرق کے فلسفہ مابعد الطبیعیات کی توجیہ و تشریح تھے۔ فرانسسی میں ان کا ترجمہ ہوا اور چونکہ اس ترجمہ کی خود ڈیکارٹ نے نظر ثانی کر لی تھی اس لئے گویا یہ دراصل اسی کی کتاب ہو گئی۔ ۱۶۴۲ء میں شائع ہوئی۔ لاطینی میں (ایمسٹرڈم ۱۶۴۲ء) دوبارہ یہ طبع ہوئی، تو ڈیکارٹ نے نام بدل دیا تھا، اور بتائے روح کے بجائے ”جسم و روح میں فرق“ دکھایا تھا۔

”مہادی فلسفہ“ ۱۶۴۴ء میں ایمسٹرڈم سے نکلی۔ فرانسسی میں اسی کا ترجمہ تین سال بعد پکیوٹ نے شائع کیا کائنات یا روشنی پر اور ”نصاب فلسفہ“ کے نام سے اس نے پہلے جو دو کتابیں لکھی تھیں، اور جن کو شائع نہیں کر سکا تھا، ”مہادی“ دراصل انھیں دونوں کی تلافی یافت، اور فطرت کے امور عامہ کی توجیہ تھی۔ ڈیکارٹ نے انسان طب اور علم حیل پر بھی اسی طرح بحث کا ارادہ کیا تھا، لیکن زندگی نے وفانہ کی اور صرف ”انسان“ پر ایک رسالہ لکھ سکا۔

ڈیکارٹ کی سب سے آخری جو کتاب شائع ہوئی وہ ”جذبات روح“ ہے (پیرس ۱۶۴۹ء) یہ چھوٹا سا رسالہ اس نے جسم اور روح (انفس) کا ایک دوسرے پر عمل اور یہ دکھلانے کے لئے لکھا تھا کہ ان دونوں کا جذبات میں کیا حصہ ہوتا ہے۔

ذیل میں کتاب طرق کا جو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، وہ ۱۶۴۶ء کی فرانسسی اصل پر مبنی ہے، اور تفکرات ۱۶۶۱ء کی فرانسسی اصل پر جو ۱۶۴۶ء کے طبع کی کررطباعت ہے۔

# دیباچہ مصنف



اگر پوری بحث ایک ساتھ پڑھنے میں زیادہ طویل نظر آئے تو اس کو  
چھ باتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، پہلے باب میں مختلف خیالات حکمیات کے  
مستحق ہیں گے۔ دوسرے باب میں جو خاص طریق مصنف نے دریافت  
کیا ہے اس کے اہم قواعد۔ تیسرے باب میں بعض وہ قواعد اخلاق جو مصنف  
نے اس طریق سے مستنبط کئے ہیں، چوتھے میں وہ دلائل ہیں جن سے  
اس نے وجودِ باری اور روح کو جو اس کے فلسفہ کی بنیاد ہیں ثابت  
کیا ہے۔ پانچویں میں ان مسائل کی ترتیب ہے جس کو اس نے دریافت  
کیا ہے اور خاص کر وہ دشواریاں جو طبیعیات سے تعلق رکھتی ہیں  
روح انسانی اور روح حیوانی کے فرق کے۔ اور آخر میں ان چیزوں کا  
ذکر ہے جو مصنف کے نزدیک کائناتِ فطرت کی تحقیق میں اس سے  
زیادہ ترقی کے لئے جتنی کہ اہم ہیں وہ ہیں، مگر وہ وہ  
جن سے وہ قلم اٹھانے پر مجبور ہوا۔

# طریق

## حصہ اول

سب سے زیادہ عقل سلیم ہی وہ چیز ہے جو آدمیوں میں نسبت  
 مساوات کے ساتھ تقسیم ہوئی ہے کیونکہ ہر شخص اپنے کو اس سے  
 اس درجہ بہرہ اندوز سمجھتا ہے کہ جو لوگ کسی شخص سے بھی مشکل مطلب  
 و آسودہ ہو سکتے ہیں وہ بھی جتنی عقل و فہم رکھتے ہیں بالعموم اس سے  
 زائد کے متمنی نہیں ہوتے اور اس بارے میں قرین قیاس یہ نہیں  
 معلوم ہوتا کہ سب کے سب غلط فہمی میں مبتلا ہوں بلکہ اس کو تو خود  
 اسی امر کا ثبوت سمجھنا چاہئے کہ حق کو باطل سے تمیز کرنے کی قوت  
 جس کا صحیح نام عقل یا عقل سلیم ہونا چاہئے، فطرۃً سب لوگوں میں  
 مساوی ہے، اور ہماری آراء میں اختلاف کی بالآخر یہ وجہ نہیں کہ بعض  
 لوگوں کو بہ نسبت دوسروں کے عقل زیادہ مقدار میں ملی ہے بلکہ اصل  
 سبب یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے اپنے خیالات کی مختلف راہوں پر  
 چل کھڑے ہوتے ہیں اور سب کی نظر ایک ہی جگہ پر نہیں رہتی  
 کیونکہ محض سلیم الفہم ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ بڑی حیرت صحیح طور پر فہم کا  
 استعمال کرنا ہے۔ بڑے بڑے دماغ جہاں عظیم الشان کارناموں کے  
 اہل ہیں وہاں بڑی بڑی لغزشیں بھی کر سکتے ہیں۔ جو لوگ آہستہ چلتے ہیں

اگر ہمیشہ راہ راست پر رہیں تو آنکا ایسے لوگوں سے سبقت لیجانا بھی ممکن ہے جو دوڑتے ہیں مگر راہ سے الگ ہو گئے ہیں۔ مجھ سے پوچھئے تو میں نے اپنے ذہن کو کسی حیثیت سے بھی عوام الناس کے اذہان سے زیادہ کاہل کبھی خیال نہیں کیا۔ مجھے تمنا رہی کہ تیری فکر یا وضاحت و صراحت تخیل میں یا حلقہ کی جامعیت اور مستعدی میں بعض دوسرے لوگوں کے ہم پلہ ہوتا۔ اور ان اوصاف کے علاوہ میں دوسرے اوصاف نہیں جانتا جن سے ذہن کامل قرار پاتا ہو۔ عقل یا فہم کی بابت میرا میلان اس حیثیت سے کہ ہم اسی کی بدولت ادھی بھلائے ہیں اسی عقیدہ کی طرف سے کہ ہر فرد بشر میں اس کا بدرجہ انہم پایا جانا لازمی ہے۔ اور اس مسئلہ پر فلاسفہ کا یہ متفقہ قول قبول کیا جاسکتا ہے کہ قلیل و کثیر کا فرق محض عوارضی میں ہو سکتا ہے نہ کہ ایک ہی نوع کے افراد کی صورتوں اور فطرتوں میں۔

بہر کیف میں اپنے اس خیال کے اظہار میں پس و پیش نہیں کرتا کہ میری بڑی خوش قسمتی تھی جو اوائل عمر سے میں اسی راہ پر لگ گیا جس سے میں نے اپنے خاص اصول و آؤکار تک پہنچ کر آنکا ایک طریقہ یا ضابطہ مرتب کر لیا اور مجھے ایک ایسا ذریعہ ہاتھ آگیا ہے جس سے میں اپنے خیال کے بموجب اپنے علم کو بتدریج وسعت و وسکا اور جہاں تک میری معمولی استعداد اور چند روزہ زندگی کفایت کرے گی بوقت رفتہ اسے تکمیل تک پہنچاؤں گا۔ کیونکہ اس سے مجھے ایسا فائدہ پہنچا ہے کہ اگرچہ میں اپنے کو نہایت حقیر سمجھنے کا عادی ہوں اور جب میں ایک فلسفی کی نگاہ سے نوع انسان کی مختلف راہوں اور مصروفیتوں کو دیکھتا ہوں تو ایسی کوئی بات شاذ ہی ملتی ہے جو فضول یا عبث نہ نظر آئے تاہم جو ترقی میں نے تلاش حق میں کی ہے اس سے دیکھ کر مجھے بہت اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ نیز آئندہ کے لئے بھی میں اس قسم کی ترقی جاری رکھنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ انسانوں کے مشاغل میں بحیثیت انسان ہو سکے

اگر کوئی مشغلہ درحقیقت اعلیٰ اور اہم سمجھا جاسکتا ہے تو یہی ہے جس کو میں نے انتخاب کیا ہے۔

پھر بھی بہت ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ جس چیز کو میں سونا اور ہیرا سمجھ رہا ہوں وہ شاید محض تانبا اور شیشہ ہی ہو۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اپنے متعلقہ امور میں اہم کیسے کیسے دھوکے کھا سکتے ہیں اور ہمارے حق میں جیب ہمارے احباب کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو وہ کس قدر مشتبہ ہوتا ہے۔ تاہم میں نے جو رائے اختیار کی ہیں وہ میں اس مقالہ میں بیان کروں گا اور اپنی زندگی کا خاکہ ایک تصویر کی طرح پیش کر دوں گا تاکہ ہر شخص اپنی جگہ پر خود فیصلہ کر سکے اور ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کی رائے جو اس بارے میں وقتاً فوقتاً مجھے معلوم ہو اس سے مجھے کچھ جدید افادہ حاصل ہو۔ بلکہ چنانچہ میں نے اس اختیار کرنے کا عادی ہو گیا ہوں ان سے علاوہ بھی کوئی راہ معلوم ہو سکے۔ سروسیمت میرا نشانہ نہیں کہ میں وہ طریقہ سکھانوں جو ہر شخص کو اپنی عقل کی صحیح رہنمائی کے لئے اختیار کرنا چاہیے بلکہ مجھے صرف وہ راہ بیان کرنی ہے جس پر میں نے اپنی عقل کو چلا سب نے کی کوشش کی ہے۔ راستہ بتانے والا راہنما پوچھنے والے کے پرستیت اپنے کو زیادہ ہوشیار خیال کرتا ہے اور اس کی نگاہیں قابل ملاحظہ ہوا کرتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ رسالہ محض ایک تاریخی بلکہ صرف ایک قصہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اس میں حتمی یا قابل تقلید باتیں یا حتمی رائے شاید ایسی بھی ہوں گی جن کی تقلید نہ کرنا ہی حق بجانب ہوگا۔ لیکن امید ہے کہ یہ رسالہ بعض لوگوں کے لئے مفید ہوگا، مگر کسی کے لئے ہوگا اور میری اس صاف گوئی سے سب خوش ہو جائے۔

مجھے علم کا پتہ نہیں ہے کہ میں جو کچھ یہ باور کروا گیا تھا کہ جو چیزیں زندگی میں کارآمد ہیں انکی واقفیت صرف اور صرف طور پر ہی درجہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہیرا شوق اور پتھر راہ گری جیب میں ہے



وہ سارا نصاب ختم کر لیا جس کے بعد سب دستور آدمی زمرہ علمائے شمار  
 ہونے لگتا ہے تو میری رائے بالکل بدل گئی۔ کیونکہ میں نے اپنے کو  
 اتنے شکوک و شبہات میں مبتلا پایا کہ یقین ہو گیا کہ میں نے اپنی تحصیل کے  
 دوران میں بس اتنی ہی ترقی کی ہے کہ ہر قدم پر اپنی لاعلمی محسوس کرتا ہوں  
 میں یورپ کی ایک مشہور درس گاہ میں تعلیم پاتا تھا اور سمجھتا تھا کہ علما اگر  
 کہیں پائے جاتے ہیں تو یہاں ضرور ہوں گے۔ وہاں جو کچھ دوسرے  
 لوگوں کو پڑھایا جاتا تھا وہی سب مجھے بھی پڑھایا گیا اور نصاب کی کتابوں پر  
 اکتفا نہ کر کے میں نے وہ سب کتابیں بھی یہاں کہیں ہاتھ لگیں پڑھ ڈالیں  
 جن کے موضوع عجیب و غریب خیال کئے جاتے تھے۔ میری بابت  
 دوسروں نے جو رائے قائم کی تھی وہ بھی مجھے معلوم تھی۔ میں نے نہیں دیکھا  
 کہ اپنے ساتھیوں میں میں کسی سے کم سمجھا جاتا ہوں۔ ان میں سے بعض  
 ساتھی ایسے بھی تھے جو پہلے سے ہمارے معلموں کی جگہ لینے کے لئے  
 منتخب ہو چکے تھے۔ غرض کہ میں سمجھتا تھا کہ ہمارا زمانہ عالی دماغ اشخاص  
 پیدا کرنے میں بلکہ اپنی ترقیوں میں بھی کسی زمانہ ناقابل سے کم نہیں اس بنا پر  
 میں نے دوسرے لوگوں کو بھی اپنے ہی اوپر قیاس کیا اور اس نتیجہ پر بھی اسی  
 طرح پہنچا کہ دنیا میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے  
 ویسا ہو جیسا کہ مجھ کو پیشتر باور آ رہا تھا۔

لیکن اس سب کے باوجود میں مدارس کی تعلیم کو عزت کی نگاہ سے  
 دیکھتا تھا میں جانتا تھا کہ جو زبانیں وہاں سکھائی جاتی تھیں وہ عقلمندی کی  
 تصانیف کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ لطیف افسانوں سے وہاں میں  
 جولانی پیدا ہوتی ہے۔ تاریخ کے یادگار کارنامے دماغ کو بلند کرتے ہیں اور  
 اگر تئیر کے ساتھ پڑھے جائیں تو رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن  
 کتابوں کا مطالعہ گویا رگلے زمانے کے بزرگوں کی ملاقات ہے جنہوں نے  
 انہیں تصنیف کیا تھا، بلکہ یہ ایسی گہری ملاقات ہے جس کے ذریعہ ہم  
 اس کے بہترین خیالات معلوم ہو جاتے ہیں فصاحت بیان میں ہے اتمہا خوبیا

اور قوتیں موجود ہیں۔ شاعری کی لطافتیں نہایت پرکیر ہیں۔ ریاضی کے انکشافات شائقین کے لئے سامانِ تشفی بلکہ بہت سے فنون کی ترقی کا باعث ہیں اور انسان کی محنت کو گھٹاتے ہیں۔ اخلاقیات کی کتابوں میں بہت سے مفید اقوال اور نیکی کی ترغیب دلانے والے مضامین ملتے ہیں۔ دنیات سے خدا کی راہ ملتی ہے۔ فلسفہ ہر امر پر بظاہر صداقت کے ساتھ بحث کرنے کے ذرائع ہیا کرتا ہے جس کی داد سادہ لوح اور کم علم لوگوں سے خوب ملتی ہے۔ اصولِ قانون طب اور دیگر علوم اپنے ترقی دینے والوں کو عزت اور دولت سے مالا مال کرتے ہیں۔ غرض کہ ان چیزوں پر توجہ کرنا فائدہ رساں ضرور ہے حتیٰ کہ ان علوم پر بھی جو غلط وادھام سے بالکل پرہیز اور یہ اس لئے کہ ان کی واقعی اہمیت کا ہم اندازہ کر سکیں اور دھوکہ سے محفوظ رہ سکیں۔

مگر میں سمجھتا تھا کہ زبانوں کے سیکھنے اور متقدمین کی تصانیف، تواریخ اور افسانوں پر اس کافی وقت صرف کر چکا ہوں۔ قدما سے گفتگو کرنا اور سفر اختیار کرنا گویا ایک ہی بات ہے۔ دوسری قوموں کے عادات و اطوار جاننا بھی مفید ہے کیونکہ اس سے خود اپنے اطوار و عادات کی بابت صحیح رائے قائم ہو سکتی ہے اور یہ خیال دور ہوتا ہے کہ جو بات ہمارے رواج کے خلاف ہو وہ خواہ مخواہ نامستقول اور مشکل خیال ہے۔ کیونکہ یہ عام طور پر انھیں لوگوں کے ذہن میں آتا ہے جن کا تجربہ اپنے وطن تک محدود ہو۔ دوسری طرف سیاحی میں یہ ہوتا ہے کہ جب زیادہ زمانہ گھر سے باہر گزر جاتا ہے تو انسان وطن ہی سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ گزشتہ زمانہ کے رسم و رواج کے زیادہ جوہیاں ہوتے ہیں وہ حال کے رواج سے گویا بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ قصے کہانیاں وہ چیزیں ہیں جن سے ناممکن واقعات کے امکان کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ سچی سچی کتب تواریخ میں بھی اگر واقعات کا بالکل غلط اندراج نہیں ہوتا یا بیان کو دلچسپ بنانے کے لئے واقعات میں چنداں مبالغہ نہیں کیا جاتا تو

کم از کم یہ کیا جاتا ہے کہ ادنیٰ اور معمولی حالات جو واقعات کے ساتھ  
 رونما ہوا کرتے ہیں حذف کر دئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس طرح  
 جو بات رہ جاتا ہے اس سے اصل حقیقت کا پتہ نہیں چلتا۔ جو لوگ اپنی  
 زندگی کے لئے صرف اسی سرچشمہ سے مثالیں ماہل کرتے ہیں وہ ایسی  
 فضول خیال آدابوں میں پڑ جاتے ہیں جن کا ذکر افسانوں میں سنا ہوگا  
 اور وہ منصوبے قائم کرنے لگتے ہیں جو ان کی بساط سے بالکل باہر ہیں۔  
 میں نے فصاحت بیان کی بہت قدر کی اور شاعری سے بھی بہت  
 لطف اٹھایا مگر میرا خیال یہی تھا کہ یہ چیزیں مطالعہ سے ماہل نہیں ہوتیں  
 بلکہ خدا داد ہوتی ہیں۔ جن لوگوں میں عقل زیادہ ہوتی ہے اور جو زیادہ  
 خوبی کے ساتھ اپنے خیالات کو صاف اور سہل بنا کر ادا کرتے ہیں وہی  
 اپنے دعووں کو ہمیشہ زیادہ منوا سکتے ہیں۔ خواہ انکی تقریر دہقانہ ہی  
 زبان میں کیوں ہو اور وہ فن خطابت سے کتنے ہی بے بہرہ کیوں ہوں  
 جن لوگوں کے ذہن دلکش و تخیل سے آلودہ ہیں اور جو اپنے خیالات  
 کو انتہائی خوبی اور مناسبت کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں وہی شاعر ہیں اگرچہ  
 وہ فن شعر کوئی سے نابلد ہی کیوں نہ ہوں۔

علوم ریاضیہ کے دلائل چونکہ قطعی اور بدیہی ہوتے ہیں اس لئے  
 مجھے ان میں خاص لطف آتا تھا مگر ابھی تک انکا استعمال پوری طرح  
 مجھے نہیں معلوم تھا۔ یہ خیال کر کے کہ ان علوم سے میکائیکی فنون میں ترقی  
 دینے میں مدد ملتی ہوگی مجھے حیرت ہوئی تھی کہ ایسی نچتہ اور مخموس بنیاد  
 پر کوئی بلند تر عمارت کیوں نہ کھڑکی کی گئی اس کے برخلاف میں پر اسے  
 زمانہ کے ماہرین اخلاقیات کی تحقیق و تجسس کو ایسے عالیشان محلوں سے  
 تشبیہ و ما کرنا تھا جن کی بنیاد ریت اور کچر سے بہتر سطح پر نہیں ہے۔ یہ لوگ  
 نیکی کی بڑائی تو بہت کرتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ دنیا میں ہی سب سے  
 زیادہ قابل قدر شے ہے مگر اس کا کوئی معیار نہیں بتانے۔ غرض کہ اکثر وہ شے  
 جس کا اٹھوں نے ایسا اچھا نام رکھا ہے وہ محض بے حسی غرور مایوسی



وغیرہ کے مرادف ہو جاتی ہے۔  
 میں اپنے علم دینہ کی عزت کرتا تھا اور مجھے بھی جنت کی آرزو تھی  
 تھی جتنی کسی اور کو ہوگی۔ لیکن جو کہ مجھے خوب یقین دلا دیا گیا تھا کہ یہ راہ  
 جس طرح اہل علم کے لئے کھلی ہوئی ہے اسی طرح جاہلوں کے لئے  
 بھی کشادہ ہے۔ نیز یہ کہ الہامی حقائق جو جنت کی راہ دکھاتے ہیں ہماری  
 سمجھ سے بالاتر ہیں لہذا میں نے ان حقائق کو اپنی عقل ناقص کی گرفت  
 میں لانے کی کوشش نہیں کی اور سمجھ لیا کہ ان کی حقیقت کو سمجھنے کی اہلیت  
 حاصل کرنے کے لئے آسمانی امداد اور فوق البشری قوت کی حاجت  
 ہوتی ہے۔

فلسفہ کے بارہ میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہو گا کہ جب میں نے  
 یہ دیکھ لیا کہ بڑے بڑے لوگ صدیوں سے اس کے درپے ہیں  
 اور پھر بھی کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو اب بھی مابہ التذاع ہو یا شک سے  
 بالاتر ہو تو میں نے اس میں ظن کو دخل نہیں دیا کہ میری سمجھ اس میدان  
 میں کچھ زیادہ کا مہیا ہے ہوگی۔ مزید یہ کہ جب میں نے ایک ایک  
 مسئلہ پر علمائے کثیرت اختلاف آراء دیکھا اور ظاہر ہے کہ ان میں سے  
 صحیح صرف ایک ہی راستہ ہو سکتی تھی تو جو کچھ شخص ظن پر مبنی ہوا۔  
 اس کو غلط فرض کر لیا۔

دوسرے علوم جس حد تک کہ وہ ان اصول پر مبنی ہیں جو فلسفہ  
 نے گئے ہیں ان کی نسبت میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایسی نازک بنیاد پر کوئی  
 مستحکم عمارت نہیں قائم کیا جاسکتی۔ ان علوم سے جو شخصیت یا عزت مد نظر  
 ہوتی ہے وہ ایسی نہیں کہ میں ان سے کہوں کہ خدا کے فضل سے  
 میری ایسی حالت نہ تھی کہ علم کو پیشہ بنانا مجھ پر مجبور ہوتا۔ افسوس کہ میں اتنا مستحکم

کہ ظن کا فلسفہ میں احتمال غالب ہے (Probable) مترجم  
 Cynic قدیم فلاسفہ یونان کا ایک فرقہ تھا جو دولت، عزت، طلب علم وغیرہ کو  
 قابل نفرت خیال کرتا تھا۔ اصطلاح میں اس کو کلیہ کہتے ہیں۔ مترجم۔

نہ تھا کہ شان و شوکت کا مہو کہ اراٹا تا ہم اس عزت کو بہت کم خطرہ میں لانا  
تھا جس کی وقعت فرضی ناموں سے زیادہ ہو اور بالآخر تمام علوم باطلہ  
کے بارہ میں سمجھ لیا کہ میں کیا کروں گے دشمنوں - نجومیوں کی پیش گوئیوں  
جادوگروں کے کرتبوں اور ان لوگوں کی کرشمہ سازی یا آلات زنی کے  
مرکز و مہوک نہ کھاؤں گا جو بہت سی ایسی چیزیں جانتے کا دعویٰ کرتے ہیں  
جن کو نہیں جانتے۔

لہذا جوں ہی میری عمر نے مجھے عقلیں کے ہاتھوں سے نجات  
دی میں نے ان علوم کا مطالعہ تو کیا علم موقوف کر دیا اور تہیہ کر لیا کہ آئندہ  
صرف اسی علم کی جستجو کروں گا جو مجھ کو خود اپنی ذات یا صحیفہ فطرت سے  
مطالعہ سے حاصل ہو سکے۔ چنانچہ فقیر ایم جوانی میں نے سیر سیاحت  
میں صرف سائنس اور فوجیوں کو دیکھا مختلف ہر شے اور مختلف  
مراج کے لوگوں سے تعلقات پیدا کیے۔

مختلف قسم کے تجربوں کو کیا اور مفید رہے جو ڈالی وہ بھی سب  
ٹھیک رہے۔ اپنے تجربوں پر اس طرح غور کرنے میں مصروف رہا کہ خود اپنی  
اصلاح کرنا چاہوں۔ کیونکہ میری سمجھ میں آ گیا کہ بہ نسبت مطالعہ گاہ کی ان  
خیالی باتوں میں جہاں کی نہ کوئی اہمیت ہے نہ ان کا کوئی اثر اپنی ذات  
پر مرتب ہوتا ہے۔ اپنی بہداشت نہیں ہو سکتی چنانچہ اس مسئلہ پر  
خس کا تعلق انسان کے ذاتی معاملات اور مسائل سے ہے۔ کیونکہ  
ہر شخص کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر میں اپنے معاملات میں غلطی  
تو مگر اس کا نقصان محسوس کروں گا۔ یہ غلط فہمی اس کے سبب انسان کو  
اپنی رائے کے کا اثر اپنے معاملات پر محسوس نہیں ہوتا تو اس کی فہم  
آرائیاں جس قدر کہ بیدار عقل ہوتی تھیں اور اس کی فہم اور اس کے غور میں  
اضافہ کرتی ہیں اور پھر اس پر عمل کیا جائے اس کے لئے ہر کی جدت  
اور فن دانی سے سلام پیش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ  
مجھے کچھ مشورے دیئے کہ غلطیوں سے بچ کر سیکھ لوں

تاکہ زندگی کی صحیح راہ اچھی طرح پہچان جاؤں اور بحسب وسعہ کے ساتھ قدم اٹھا سکوں۔

یہ سچ ہے کہ جب تک میں دوسروں کے عادات و اطوار پر غور کرتا رہا اُن میں بھی مجھے تسکین بخش باتوں کے آثارِ شاذ ہی ملے اور فلاسفہ کے تناقضات سے شاید ہی کچھ کم تناقضات ان میں پائے گئے مگر اس مطالعہ سے سب سے بڑا فائدہ یہی ہوا کہ میں نے بہت سی ایسی چیزیں دیکھیں جو ہم کو خواہ کتنی ہی فضول اور مضحکہ خیز کیوں نہ معلوم ہوتی ہوں لیکن دوسری بڑی بڑی قوموں میں مقبول عام اور پسندیدہ خیال کیجاتی ہیں۔ اس سے مجھے ایسا سبق حاصل ہوا کہ اب کسی امر کو صرف اس بنا پر نہ ہرگز نہ یقین کر دوں گا کہ اُس کی صداقت کسی نظریہ یا رواج پر مبنی ہے۔ چنانچہ میں نے تبدیلیِ رجحان سے ایسی غلطیوں سے اپنے کو نکال لیا جو ہماری قطری روشنی کو ماند کرنے اور عقلِ سلیم سے بڑی حد تک محروم رکھنے کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن جب اوراقِ عالم کے مطالعہ میں کبھی برس گزر گئے اور کچھ تجربہ بھی حاصل ہو گیا تو میں نے اپنے نفس کا مطالعہ کرنے اور اپنی تمام ذہنی قوتوں کو اُن راہوں کی تلاش میں صرف کرنے کا تہیہ کر لیا جن پر مجھے چلنا چاہئے۔ اس راہ میں مجھے اتنی کامیابی نصیب ہوئی کہ اگر میں اپنے وطن یا اپنی کتابوں سے جدا ہوا ہوتا تو ہرگز نہ ہوتی۔

## حصہ دوم

اُن دنوں جب برمنی میں جنگ ہو رہی تھی جس کا سلسلہ  
 اب تک جاری ہے میں وہیں تھا اور شہنشاہ کی تاجپوشی سے فوج کو  
 جارہا تھا کہ آمد سرمانے مجھے ایک ایسے مقام پر مقید کر لیا جہاں میری  
 دل بستگی کے لئے کوئی صحبت نہ تھی مگر خوش قسمتی یہ کہ کسی فکر و تشویش کا  
 دل پر اثر نہ تھا دن بھر تنہائی میں اپنے خیالات پر توجہ کرنے کا پورا موقع  
 حاصل تھا چنانچہ جو سب سے پہلے خیال میرے ذہن میں آیا یہ تھا کہ  
 نسبت اُس کام کے جس کو ایک ہی کارگیر نے انجام کو پہنچایا ہو ایسا  
 کام شاید ہی درجہ کمال حاصل کرتا ہے جو متعدد اجزاء میں منقسم ہو کر مختلف  
 ہاتھوں سے انجام پائے۔ جن عمارتوں کی نقشہ کشی اور تیاری ایک ہی  
 شخص نے انجام دی ہو وہ بہ نسبت ایسی عمارتوں کے عموماً زیادہ نفیس  
 اور اچھی ہوتی ہیں جن میں متعدد اشخاص شریک رہے ہوں اور جن کی  
 ایرانی دیواروں سے ایسے کام لئے گئے ہوں جن کے لئے دراصل  
 وہ نہیں بنی تھیں۔ یہی صورت اُن شہروں کی ہے جو ابتدا میں محض  
 گاؤں تھے اور ایک مدت کے بعد بڑے بڑے شہر بن گئے۔ یہ شہر  
 عموماً اُن شہروں کے مقابلہ میں نہایت بد قطع ہیں جن کو کسی ماہر  
 تعمیرات نے ایک کھلے میدان میں ایک ہی تجویز کے ماتحت باقاعدہ  
 طور پر بنوایا ہو۔ اول الذکر کی بعض عمارتیں خواہ خوش خالی میں موخر الذکر کی بعض  
 عمارتوں سے بہتر ہی کیوں نہ ہوں مگر جب انکی باہمی ناموزونیت پر نظر  
 پڑتی ہے کہ کہیں کوئی عمارت چھوٹی ہے تو کوئی بڑی جس سے وہاں

سڑکیں تک پڑھتی پڑھتی ہو رہی ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ یہ صورت زیادہ  
 تر اتفاق ہی سے رونما ہوئی ہے اور اس میں کسی ایک سے ارادہ  
 اور تجویز کو دخل نہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ موجود  
 تھے جن کا منصب اس قسم کی نگرانی تھا کہ شخصی عمارات شہر کی عمار  
 آرائش کے منافی نہ ہوں تو ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ دوسروں  
 کی بنیادوں پر اپنا کمال پوری طرح دکھانا ہر وقت و شواہ ہے۔ اس طرح یہ نسبت  
 ان اقوام کے جنہوں نے جماعت کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے کسی عالی  
 دماغ مقنن کے احکام قبول کر لئے ہوں ان تو سوں کا نظام مکمل ہو گا  
 جو اپنی نیم وحشیانہ حالت سے بچوں جوں ہندیب کی طرف بڑھتی گئی  
 ہیں جراثیم اور نزاعات کی مضر نواں کے تدریجی تجربہ سے اپنی قوانین  
 مرتب کرتی گئی ہیں چنانچہ یہ بھی یقینی ہے کہ سچے مذہب کا نظام جسکا  
 سرچشمہ خود خدا ہی ہو لازمی طور پر پیش اور اعلیٰ ہو گا۔ انسانی معاملات  
 کو لیجئے تو میں سمجھتا ہوں کہ اسپارٹا کی قدیم عظمت اس وجہ سے  
 نہ تھی کہ اس کا ہر قانون خوب تھا۔ بحالات اس کے وہاں کے  
 بہت سے قوانین عجیب و غریب بلکہ اخلاق کے بھی منافی تھے مگر  
 یہ چونکہ ایک ہی شخص کے وضع کئے ہوئے تھے اس لئے سب کے  
 سب ایک ہی نتیجہ کی طرف راجع تھے۔ علیٰ ہذا میرا خیال یہ بھی ہوا  
 کہ جو علوم کتابوں میں ہیں (خاص کر وہ جو محض طبعی اور تجربی ہیں)  
 اور جو بہت سے مختلف اشخاص کے خیالات کو وقتاً فوقتاً یکجا کر کے  
 مرتب کر دئے گئے ہیں وہ ان سیدھے سادے نتائج کی بنیبت  
 صداقت سے زیادہ بعید ہیں جو کسی ایک صحیح العقول شخص نے اپنی  
 بے لوث قوت منہ سے کام لیکر اور ذاتی تجربہ کے اندر دیکر اندر کئے  
 ہوں۔ چونکہ ہم طفلی کے بعد جوانی کو پہنچتے ہیں اور لازماً عمر تک  
 ایک تو خود اپنی خواہشوں کی اور دوسرے اپنی تعلیم کی پیروی  
 کرتے رہتے ہیں (حالانکہ ان دونوں چیزوں میں بعض اوقات بڑا فرق



ہوتا ہے اور صحیح مشورہ ان میں سے کسی سے نہیں ملتا اس لئے میں نے  
 یہ نتیجہ نکالا کہ یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ہمارے فیصلے اُس قدر درست  
 اور سچے ہوں جیسے اُس صورت میں ہوتے کہ ہماری عقل بیدار نش  
 کے وقت سے کامل ہوتی اور ہمیشہ ہم اُسی کی پیروی کرتے ہوئے  
 رہتے۔ سچ ہے کہ کسی شہر کے مکانات محض اس لئے نہیں بنائے  
 جاتے کہ ان میں از سر نو ایک طرز پر تعمیر کیا جائے اور سڑکیں خوشنما  
 ہو جائیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص بطور خود اپنا گھر نئے  
 طرز پر بنانے کے لئے ڈھادے۔ بلکہ جب کسی مکان کی بنیادیں کمزور  
 ہو جاتی ہیں اور اُس کے گرنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو انہیں مجبوراً  
 اُسے منہدم کرنا ہوتا ہے۔ اس مثال سے میری یہ رائے قائم ہوتی  
 کہ کسی حکومت کی اصلاح و ترمیم کے لئے اُس کے نظام اساسی کو  
 یکظم الٹ دینے کی کوشش محض حماقت ہوگی اور میرے نزدیک  
 یہی بات اُس قسم کے منصوبوں پر بھی صادق آتی ہے جو درس گاہوں  
 کے مروجہ علوم یا نصاب تعلیم کی بابت ہوں۔ جو خیالات میں نے اُس  
 وقت تک قائم رکھے تھے میرے نزدیک خود میرے لئے اس سے  
 بہتر کچھ نہ تھا کہ انہیں ذہن سے بالکل محو کر دینے کا فیصلہ کر لوں تاکہ  
 یا تو صحیح تر خیالات اختیار کر سکوں یا اگر وہ عقل کی کسوٹی پر ٹھیک آئیں  
 تو پھر انہیں پر آجاؤں۔ میرا یہ پختہ ارادہ تھا کہ اس طرح اپنی زندگی میں  
 مجھے زیادہ کامیابی ہوگی بمقابلہ اس کے کہ صرف پرانی بنیادوں پر عمارت  
 بناتا رہوں اور انہیں اصول پر تکیہ کر لوں جنہیں سند و اعتبار کی بنیاد پر  
 میں نے قبول کر لیا تھا۔ اگرچہ میں اپنے اس فیصلہ میں چند مشکلات  
 محسوس کرتا تھا مگر یہ مشکلات لا محفل نہ تھیں نہ ویسی تھیں جیسی کہ امور عام  
 کی ادنیٰ سے ادنیٰ اصلاح میں پیش آتی ہیں۔ بڑے بڑے اجسام جب  
 ایک بار شکست ہو جاتے ہیں تو مشکل سے دوبارہ قائم ہوتے ہیں بلکہ  
 ان کا ایک مرتبہ متزلزل ہو جانا بھی قیامت ہوتا ہے اور پھر ان کو

کھڑا رکھنا ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ پس حکومتوں کے نظام میں اگر کچھ سقم موجود بھی ہیں (اور یقیناً ہوتے ہیں جیسا کہ اُن کے اخلاقیات ہی سے ظاہر ہوتا ہے) تو ساتھ ہی رواج نے اُن کی بیدار کی ہوئی زحماتوں کو بہت کچھ ہموار بھی کر رکھا ہے۔ اور اُن سے بچاؤ کا بھی کافی انتظام کر دیا ہے بلکہ ایک غیر محسوس حد تک ایسی اصلاح بھی کر دی ہے جو محض حسن تدبیر سے نہ بن آتی۔ غرض کہ یہ خرابیاں تقریباً ہمیشہ اُن تغیرات کے مقابلہ میں زیادہ آسانی سے برداشت ہو سکتی ہیں جو انھیں دور کرنے سے لازم آتے ہیں۔ اسی طرح وہ شامل ہیں جو کثرت آمد و رفت سے پہاڑوں میں قائم ہو گئی ہیں اور گھومتی ہوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ اس قدر ہموار اور آسان ہو گئی ہیں کہ انھیں اختیار کرنا اس زیادہ اچھا ہوتا ہے کہ کوئی ایسی سیدھی راہ تلاش کی جائے جس میں کبھی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا پڑے تو کبھی گھالی کی تہ تک اترنا پڑے۔ اسی وجہ سے میں اُن چلتے ہوئے لوگوں کو جو ہرام میں سرگرمی سے دخل دینے لگتے ہیں ذرا بھی پسند نہیں کرتا۔ خاص کر اُن کو جو نہ تو خاندانی ہونے کی وجہ سے انصرام امور عامہ میں پوچھے جاتے ہیں اور نہ کسی ذاتی خوش نصیبی کی وجہ سے اس لائق خیال کئے جاتے ہیں اور پھر بھی اصلاحات کے منصوبے بگھارا کرتے ہیں۔ اگر مجھے ذرا بھی گمان ہوتا کہ اس رسالہ میں ایسی کوئی چیز شامل ہو گئی ہے کہ خود مجھ پر اسی قسم کی حاکمت کا الزام جائز طور پر عائد ہو سکیگا تو میں ہرگز اس کی اشاعت کو اراکرتا کیونکہ سب سے زیادہ یہی چیز میرے پیش نظر رہی ہے کہ اپنے خیالات کی اصلاح کروں اور انھیں ایسی بنیاد پر قائم کروں جو تمام شریکی ہی ہو۔ گو خود اپنے کام سے مطمئن ہو جانے کی وجہ سے میں نے اُس کا ایک خاکہ یہاں پیش کر دیا ہے مگر میں کسی دوسرے کو کسی عنوان سے بھی اپنی ایسی جرأت کرنے کا مشورہ نہیں دیتا۔ خدا نے جس کو زیادہ استعداد دی ہے وہ شاید اس سے بہتر نمونہ پسند کریں۔

مگر بہت سے لوگوں کے لئے مجھے اندیشہ ہے کہ میری نقالی خطرہ سے  
خالی نہیں۔ یہ چیز ہر ایک کے لئے ٹھیک نہیں ہے کہ میری طرح اپنے  
پر اسے عقاید سے بالکل برابر کرے۔ زیادہ تر لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں  
جن میں سے کسی کے لئے یہ تجویز موزوں نہیں۔ اول تو وہ جو اپنی استعداد  
پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کر کے بے دھڑک کوئی فیصلہ کر لیا کرتے  
ہیں اور جس قدر تحمل خیالات کو باقاعدہ اور جامعیت کے ساتھ راہ راست  
پر لانے میں درکار ہوتا ہے ان میں نہیں ہوتا ایسے لوگ جب ایک  
مرتبہ اپنے عقائد خیالات میں شک کرنے کی آواز دی یا جائیگے اور پرانی  
لکیر چھوڑ دیں گے تو ہرگز راہ راست پر آنے کے لائق نہ رہیں گے۔  
بلکہ وہ خود کو کھو بیٹھیں گے اور زندگی بھر بھٹکا کریں گے۔ دوسرے  
وہ لوگ ہیں جنہیں یہ اندازہ کرنے کے لئے کافی سمجھ اور بردباری ہے کہ  
دنیا میں ان سے بہتر لوگ جو خطا اور صواب میں تمیز کر سکیں موجود  
ہیں اور دوسروں کی رہبری کر سکتے ہیں چنانچہ ان لوگوں کو چاہئے  
کہ بجائے اپنی عقل پر زیادہ بھروسہ کرنے کے ان کے کہنے پر چلیں۔  
اپنی بابت بھی میری یہی رائے ہے کہ اگر میری تربیت صرف ایک استاد کی ہوتی  
یا اگر مجھے ان اخلاف آرا کا علم نہ ہوتا جو یہ معلوم کس زمانہ سے بڑے  
بڑے علما میں چلے آتے ہیں تو میں بلا شک اس سو خیر الذکر قسم کے  
لوگوں میں شامل ہونا پسند کرتا۔ لیکن اپنے ابتدائی زمانہ میں جو کالج  
کی زندگی کا زمانہ تھا میں آگاہ ہو گیا تھا کہ کوئی رائے خواہ وہ کتنی ہی  
لغو اور ناقابل پذیرائی کیوں نہ ہو تصور میں نہیں آ سکتی جو کسی نہ کسی فلسفی  
نے قائم نہ کی ہو۔

اپنی سیاحت کے اثنا میں مجھے یہ غور کرنے کا موقع ملا کہ جن  
لوگوں کی آراء مسلمہ طور پر جاری آراء کے خلاف ہیں وہ لوگ محض اس  
بنا پر وحشی اور غیر مہذب نہیں قرار دیئے جاسکتے۔ اور باوجود اس  
اخلاف کے ان میں ایسے گروہ موجود ہیں جو اپنی عقل سے اگر ہم سے



بہتر طریقہ سے نہیں تو ہماری ہی طرح بخوبی کام لیتے ہیں۔ مجھے یہ بھی  
 محسوس ہوا کہ وہ شخص جس نے بچپن سے فرانس یا جرمنی کے سے  
 ملک میں پرورش پائی ہو اس کی سیرت ان احوال میں کیسی ہوگی  
 اور اگر وہی شخص اسی ذہن کے ساتھ ہمیشہ اہل چین کے ہمراہ رہے  
 یا کسی وحشی گروہ کے ساتھ رہے پرورش پاتا تو اس کی سیرت میں کیا  
 فرق ہوتا۔ لباس کو لیجئے تو ہم جس وضع کو دس برس پہلے پسند کرتے  
 تھے (اور بہت ممکن ہے کہ آئندہ دس برس کے اندر ہم کو پھر وہی وضع  
 پسند آنے لگے) وہ آج کس قدر ہی ہودہ اور مضحک معلوم ہوتی ہے۔  
 اس سے میں نے نتیجہ یہ نکالا کہ ہماری رائے بجائے اس کے کہ  
 علمیت پر مبنی ہو زیادہ تر روان پر مبنی ہو اگر تھی ہے بالآخر گو ہماری  
 آرا کی یہی بنائیکوں ہو مگر میں نے یہ اخذ کیا کہ جہاں حقیقت کا دریافت  
 کرنا دشوار ہوتا ہے وہاں محض کثرت رائے حقیقت کی ضامن نہیں  
 بلکہ ایسی صورتوں میں متعدد آدمیوں کے مقابلہ میں ایک شخص کا  
 حقیقت تک پہنچنا زیادہ قرین قیاس ہوتا ہے۔ بہر کیف کسی جم غفیر  
 سے تو میں کسی کو منتخب نہ کر سکا جس کی رائے قابل ترجیح نظر آئیں  
 اور اس وجہ سے میں نے اپنی زندگانی کی رہبری اس کے لئے اپنی ہی  
 عقل سے کام لینے پر خود کو مجبور پایا۔

لیکن ایسے شخص کی طرح جو بلا مدد غیر سے اندھیرے میں  
 جا رہا ہو میں نے اہستہ روی اختیار کی اور اس قدر چھوٹک بھونک  
 کر قدم رکھا کہ چاہے زیادہ نہ بڑھ سکوں مگر گرنے پڑنے سے محفوظ  
 رہوں۔ دوسری طرف میں نے یہ بھی نہیں پسند کیا کہ جو آہ بلا مدد  
 عقل میرے عقائد میں جا گزریں ہو گئی تھیں ان میں یکسکھم سرسری طور پر  
 اپنے ذہن سے خارج کردوں بلکہ اس میں میں نے کافی وقت صرف  
 کیا کہ پہلے احتیاط کے ساتھ اپنے کو اس کام کی سرشت سے آشنا  
 بنالوں جسے میں نے اپنے ذمہ لیا ہے اور جس طریقہ صحیح کے ذریعہ

میں اپنی بساط بحیر علم حاصل کر سکوں گا اُس کی پوری تحقیق بھی کر لوں۔  
 فلسفہ کے مختلف شعبوں میں میں نے منطق کی طرف  
 بہت ابتدائی زمانہ میں توجہ کی تھی اور ریاضیات کے شعبوں میں  
 علم ہندسہ اور جبر و مقابلہ کی طرف بہ یہ تینوں علوم وہ ہیں جنہیں  
 میں اپنے مقصد کے لئے مفید خیال کرتا تھا مگر جانچ کرنے سے پتہ  
 چلا کہ منطق کی گردانیں اور اس کے اکثر قواعد بجائے اس کے کہ  
 غیر معلوم کی تحقیق میں کام آئیں زیادہ تر معلوم کے اظہار میں کام میں لائے  
 جاتے ہیں یا جن چیزوں سے ہم بالکل لاعلم ہیں انہی بابتہ بلا حکم لگائے  
 بحث کرنے میں (جیسا کہ تہیہ کرتے ہیں) اگرچہ منطق میں واقعی نہایت  
 صحیح اور عمدہ قواعد موجود ہیں مگر بہت سے قواعد وہ بھی ہیں جو نہایت  
 مضمر اور فغصول ہیں اور ان دونوں قسموں میں حق اور باطل کی شناخت  
 اور دونوں کا جدا جدا کرنا کوہ کندن و کماہ بر آوردن سے کم نہیں۔ اس کے  
 بعد متقدمین کی تحلیل ہندسی اور متاخرین کے جبر و مقابلہ کی یا تہ میری  
 یہ رائے قائم ہوئی کہ ان دونوں کا تعلق نہایت مجرد مواد سے  
 ہے جو بظاہر کسی مصروف کا نہیں ہوتا۔ اول الذکر تو اس قدر قطعیت  
 کے ساتھ اشکال کی بحث تک محدود ہے کہ بغیر قوت تخیل کو تھکائے  
 ہوئے فہم کام نہیں کرتی اور موخر الذکر میں قواعد اور مقررات کی اس قدر  
 پکی پابندی ہے کہ یہ فن براگندگی اور ابہام کا مجموعہ ہو گیا ہے اور  
 ذہن کو بجائے ترقی دینے کے تشویش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ چنانچہ  
 میں ایک دوسرے ہی طریقہ کی تلاش پر مجبور ہوا جس میں ان تینوں  
 علوم کی خوبیاں تو ہوں مگر یہ عیوب نہ پائے جائیں قوانین کی کثرت  
 اکثر مانع انصاف ثابت ہوتی ہے۔ (کیونکہ حکومت اُسی ملک کی  
 اچھی ہوتی ہے جہاں قوانین تھوڑے ہوں مگر ان کا نفاذ سختی سے  
 کیا جاتا ہو) بعینہ ہی صورت منطق کی ہے کہ قواعد کی کثرت سے اس کا  
 مقصد فوت ہوا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے غور کیا کہ بجائے اتنے قواعد

اگر ذیل کے صرف چار قاعدے میں پیش نظر رکھوں اور ان پر استقلال کے ساتھ چمار ہوں تو یہ میرے مقصد کے لئے کافی ثابت ہو سکے۔  
 (۱) اول یہ کہ کسی ایسی چیز کو جس کا صحیح ہونا صائب طور پر نہ معلوم کر لوں صحیح نہ باور کروں یعنی عجلت اور تعصب سے ہوشیاری کے ساتھ گریز کروں اور اپنے فیصلہ میں بجز اس کے کچھ نہ شامل کروں جو اس قدر صائب اور واضح ہو کہ جب ذہن میں آئے تو اس میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہ ہو۔

(۲) دوم یہ کہ جن مشکلات کو حل کرنا ہوا ان کے جتنے حصے ہو سکیں (یعنی جتنے انھیں حل کرنے کے لئے ضروری ہوں) اُن حصوں میں ان کو منقسم کر دوں۔

(۳) سوم یہ کہ اپنے خیالات میں یہ ترتیب ملحوظ رکھوں کہ ابتدا ان اشیاء سے ہو جنہیں معلوم کرنا سہل ترین ہوتا کہ پیچیدہ امور کا علم رفتہ رفتہ اور نہینہ نہینہ حاصل ہوتا رہے اور اس طور پر کہ جن چیزوں میں بجائے خود کوئی رشتہ مقدم و موخر کا نہیں ہے ان کی بھی کوئی مقرر ترتیب ذہن میں قائم ہو جائے۔

(۴) چہارم یہ کہ ہر صورت میں اس قدر مکمل محاسبہ اور ہمہ گیر تبصرہ کروں کہ کسی چیز کے نظر انداز ہونے کا گمان نہ ہو سکے۔  
 سہل اور سلیس قیاسات کے طویل سلسلوں نے جن سے اباب ہندسہ اپنے دشوار ترین استدلال کے نتائج تک پہنچتے ہیں مجھے یہ خیال دلایا کہ جن اشیاء کے علم کی اہلیت انسان میں ہے ان میں باہمی تعلق بھی اسی طور پر ہے۔ نیز یہ کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو ہماری رسائی سے باہر یا ہم سے اس قدر پوشیدہ ہو کہ اس کو ہم دریا ہی نہ کر سکیں مگر شرط یہی ہے کہ باطل کو حق مان لینے سے بچتے رہیں اور خیالات میں اس ترتیب کو باقی رکھیں جو ایک حقیقت کو دوسری حقیقت سے مستنبط کرنے کے لئے ضروری ہے۔ ابتدا جن چیزوں سے کرنی تھی

انہیں دریافت کرنے میں مجھے کچھ وقت نہیں ہونی کیونکہ مجھے پہلے ہی خیال پیدا ہوا تھا کہ ابتداً انہیں چیزوں سے ہونی چاہئے جن کا معلوم کرنا سب سے سہل اور آسان ہے۔ جن لوگوں نے ملکیات میں تلاش حقیقت کی ہے ان میں ریاضی واسے ہی وہ تھے جنہوں نے اپنے لئے براہین یعنی بدیہی اور موقوف وجوہ دریافت کئے اور مجھے کوئی شک باقی نہ رہا کہ ان کا طریق تحقیق بھی اسی اصول پر تھا۔ پس گویا میں نے اس کے سوا کچھ فائدہ نہیں سوچا کہ اپنے ذہن کو حق پسند کا اور غیر مستقیمہ نقل سے نفرت کا عادی کیا جائے۔ چنانچہ میں نے سادہ ترین اشیاء کی جانچ سے ابتدا کرنے کا تہیہ کر لیا مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ان تمام علوم کا باہر ہو جانے کا بھی ارادہ کر لیا تھا جو عموماً ریاضیات سے تعبیر ہوئے ہیں۔ بلکہ میں نے یہ دیکھ کر کہ جن چیزوں سے ان میں بحث کی جاتی ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں اشیاء کے باہمی اضافات اور تناسبات پر ضرور غور کیا جاتا ہے، میں اپنی ضروریات کے لئے ہی بہتر سمجھا کہ ان تناسبات پر نہایت عمومیت کے ساتھ بغیر کسی جزئی شے پر ان کو محمول کیا انہیں ایک محدود کئے ہوئے ان پر غور کروں (بجز اس صورت کے کہ ان کا علم حاصل کرنے میں بغیر جزئی اشیاء کے حوالے کے دشواری کا خیال ہو)۔ مثلاً یہ تھا کہ جہاں کہیں یہ تناسبات دوسری قسم کی اشیاء پر جائز طور پر عائد ہو سکیں وہاں انہیں عائد کرنے کی جگہ میں بہتر استدلال پیدا ہو جائے۔ پھر یہ محسوس ہوا کہ ان اضافات کو سمجھنے کے لئے بھی تو ان پر فرداً فرداً غور کرنا ہوگا اور کبھی انہیں مجموعی طور پر قبول کرنا یا محض ذہن میں محفوظ رکھنا ہوگا۔ پس مجھے یہ خیال ہوا کہ ان پر فرداً فرداً غور کرنے کی غرض سے ان پر اس طرح نظر کرنا چاہئے کہ گویا وہ خطوط مستقیم کے درمیان ہیں۔ کیونکہ خطوط مستقیم سے زیادہ سادگی اور وضاحت کے ساتھ دائرہ و خیل اور حواس میں آنے والی کوئی چیز

دستیاب نہ ہو سکی۔ دوسرے یہ کہ اُن کو حافظہ میں باقی رکھنے یا اُن کا کوئی مجموعہ قبول کرنے کے لئے انہیں بعض نہایت مختصر علامات سے ظاہر کرنا ہو گا۔ اس طرح میرا عقیدہ ہوا کہ جو کچھ تحلیل ہندسی اور جبر متقابل میں بہترین مواد ہے مجھے سب حائل ہو سکتا ہے اور ایک چیز کا سقم دوسری چیز کی مدد سے دور ہو سکتا ہے۔ فی الواقع میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان پر دو علوم کے مسائل حل کرنے میں مجھے اس قدر سہولت ہوئی کہ دو یا تین مہینہ صرف کر کے میں نے نہ صرف اُن کو حل کر لیا بلکہ جن مسائل کے حل کرنے سے قاصر رہا اُن کی بابت اپنے نزدیک اتنا ضرور دریافت کر لیا کہ وہ کس ذریعہ سے اور کس حد تک حل ہو سکتے ہیں اور یہ نتیجہ ہے اس امر کا کہ میں نے نہایت سادہ اور عمومی حقائق سے ابتدا کی تھی اور اس طرح جو حقیقت بھی شکست ہوئی ایک ایسے قانون کے مرادف تھی جو آئندہ حقائق کی جستجو میں کام آئے۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ جب ہر امر کی حقیقت ایک ہی ہو ا کرتی ہے تو جو اس سے واقف ہو گیا اُس نے اس امر کی بابت جو کچھ معلوم ہو سکتا تھا سب معلوم کر لیا تو یہ بات چنداں غلط نہو گی۔ مثلاً اگر کسی بچہ کو علم الحساب کے مساویات سکھا دئے گئے ہوں اور اُس نے جمع کے قاعدہ کا کوئی خاص سوال لگا لیا ہو تو قاعدہ کے روئے اُس مجموعہ اعداد کی بابت (جو جوڑنے کے بعد اُس کے پیش نظر ہوا ہے) یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ عقل انسانی کی بساط بھر تھا وہ سب اُس بچے کو دریافت ہو گیا۔ غرض کہ جو طریقہ صحیح ترتیب کی پابندی عائد کرتا ہے اور نئے مطلوبہ کی تمام حالات کا صحیح شمار سکھاتا ہے گویا اُس میں وہ سب باتیں موجود ہیں جن کی بنا پر علم الحساب کے قواعد پایہ و فوق کو پہنچتے ہیں۔

مگر اس طریقہ کی طرف سے میرا اطمینان خاص کر اس یقین کی بناء پر ہو گیا کہ میں اگر پورے کمال کے ساتھ نہیں تو کم از کم اتنے کمال کے



ساتھ ہر معاملہ میں اپنی عقل سے کام لے سکتا ہوں جتنا میری ذات میں  
 پیدا ہو سکتا ہے۔ علاوہ بریں مجھے یہ احساس بھی ہو گیا کہ اس طریقہ پر  
 عمل پیرا ہونے سے میرا ذہن اشیاء کے نہایت صاف اور ہمین تصور  
 کا عادی ہوتا جاتا ہے۔ اس طریقہ کو میں کسی خاص معاملہ تک نہیں محدود کرتا  
 تھا اس لئے مجھے یہ امید بھی ہوئی کہ جتنی کامیابی مجھے جبر و مقابلہ کی شکلا  
 حل کرنے میں ہوئی دوسرے علوم میں اس سے کم کامیابی نہوگی۔  
 مگر تاہم میری برائت ہوئی کہ تمام علوم میں جو دشواریاں ہیں ان سب  
 کا ایک غور کرنے لگوں۔ کیونکہ یہ بات اس طریقہ کی بتائی ہوئی ترتیب  
 کے خود غلات ہوئی۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ ان کا علم فلسفہ سے اخذ  
 ہوئے اصول پر مبنی ہے اور اس میں کوئی نئے یقینی نہیں ہے، ضروری  
 معلوم ہوا کہ سب سے پہلے اس کے اصول خود قائم کرنے کی کوشش  
 کروں۔ علاوہ بریں چونکہ اسی قسم کی تحقیق سب سے زیادہ اہمیت  
 رکھتی ہے۔ اور اس میں عجبت پسندی اور قیاس آرائی سے اڑھوڑنا  
 چاہیے، میری رائے یہ قائم ہوئی کہ جب تک میرا سن کچھ اور زیادہ نہو جائے  
 (کیونکہ میری عمر اس وقت صرف ۲۲ سال کی تھی) اور اس کام کی تیاری  
 میں جب تک کافی وقت نہ صرف کر لوں بلکہ اس وقت تک جتنے غلط  
 خیالات قائم ہو چکے تھے سب کو ذہن سے خارج نہ کر لوں یہاں تک  
 کہ میرے دلائل تجربات کی تیار پر مضبوط ہو جائیں اور اس طریقہ سے کام  
 لینے کی مشق بڑھ جائے اس وقت تک اس تحقیق کی اہلیت مجھ میں  
 نہوگی۔



## حصہ سوم

جب کسی کو از سر نو اپنا مکان بنانا ہوتا ہے تو وہ صرف معمار ہی نہیں ڈھونڈتا بلکہ اپنا عارضی مسکن بھی تلاش کر لیتا ہے بغیر اس کے تعمیر جدید میں بے تحاشا مصروف ہو جانا کوئی صحیح اصول نہیں۔ پس جب میری عقل نے مجبور کیا کہ ابھی اپنا فیصلہ ملتوی رہنے دوں تو میں نے ایک عارضی دستور العمل بنالیا تاکہ آئندہ اپنے کام میں کوئی تردد کا موقع نہ پاؤں اور اطمینان سے اپنا مشغلہ جاری رکھوں۔ اس دستور العمل کے چند ہی قواعد تھے جو یہ ہیں۔

اول یہ کہ جس مذہب کی تعلیم خدا کے فضل سے مجھے بچپن سے دی گئی ہے اس پر قائم رہ کر اپنے ملک کے قوانین اور رسم و رواج کا پابند رہوں اور دوسرے معاملات میں اتنا پسندی سے دور رہوں اور اعتدال کو مقدم رکھوں بلکہ اپنے اعمال و اطوار ایسے اصول پر رکھوں کہ میری روش میرے عقلمند پیروسیوں کو ناپسند نہ ہو۔ چونکہ اب میں نے اپنے تصور رات کو بھیج سمجھ کر ان کی جانچ شروع کر دی تھی اس لئے دوران تحقیقات میں یہی مناسب تھا کہ جن کو دنیا عقلمند سمجھتی ہو ان کی پیروی کروں اور ان رہبروں کا انتخاب ایران و توران کے لوگوں میں سے نہیں بلکہ اپنے آس پاس کے لوگوں میں سے زیادہ بہتر نظر آیا۔ اب سوال یہ تھا کہ ان منتخب عقلا کی واقعی رائے کیا ہے جس پر عمل کیا جائے تو میں نے ان اصول اخلاق کو کبھی اخذ نہیں کیا جو ان کے اقوال سے ظاہر ہوئے تھے بلکہ صرف

وہ اصول جھانسنے جو اُن کے اعمال میں مضمر تھے۔ دنیا میں لوگوں کے  
اطوار ایسے بگڑ گئے ہیں کہ ایسے لوگ شاذ ہی ملتے ہیں جن کے اقوال  
اُن کے عقائد کی صحیح ترجمانی کرتے ہوں۔ اور بہر نوع  
بہت سے لوگوں کو خود انہیں معلوم ہوتا کہ واقعی اُن کا عقیدہ کیا ہے۔  
اس کی وجہ یہ ہے کہ ذہن میں عقیدہ کا قائم ہونا اور عقیدہ کا علم میں آنا یہ  
ذہن کے جدا جدا افعال ہیں اور اکثر ہوتا ہی ہے کہ جب اول الذکر پایا  
جاتا ہے تو سو خیر الذکر نہیں بھی پایا جاتا۔ اب جس مسئلہ پر مقدمات میں  
اور مقبولیت کے لحاظ سے اُن میں سے کوئی قابل ترجیح نہ نظر آئے تو  
ایسی صورت میں اُن آراء کو ترجیح دینا تھا جو مجھے شان اعتدال سے  
زیادہ قریب نظر آتی تھیں۔ میرے نزدیک ”خیر الامور اوسطھا“ کے مسلک  
پر چلنا سب سے آسان اور غالباً سب سے بہتر بھی ہے اور افراط و تفریط  
میں عموماً خرابیاں پڑتی ہیں۔ اس اصول پر چلکر اگر میں خطا میں بھی مبتلا  
ہوتا تو صواب سے زیادہ دور نہ ہوتا۔ بہر کیف یہ اُس سے تو بہتر ہی تھا  
کہ کبھی ایک انتہا پر پہنچ کر پشیمان ہونا پڑنا کہ کاش ہم نے دوسری انتہا  
اختیار کی ہوتی جن امور کو میں انتہا پر شمار کرتا ہوں ان میں اُس قسم کے  
مواعید بھی ہیں جو ذاتی آزادی کو محدود کرتے ہیں۔ میری یہ مراد نہیں  
کہ میں اُن قوانین سے بھی مستغفر تھا جو عہد و معاہدہ کے معاملات میں فریقین  
پر قیود عائد کرتے ہیں کیونکہ یہ تو وہ قواعد ہیں جن سے ضعیف الارادہ لوگوں کو  
پابند کرنا ضروری ہے اور بالآخر ان سے انھیں لوگوں کی بہبودی تصور ہے  
البتہ چونکہ مجھے دنیا میں تغیر سے بالاتر کوئی چیز نہ ملی اور میں اس کوشش میں شہک  
تھا کہ اپنے علم کو وسعت دوں اور اپنے فیصلوں کو حد کمال تک پہنچاؤں  
اس لئے میں نے کبھی ایسی شخص پروری جائز نہیں رکھی کہ چونکہ میں نے آج  
کسی چیز کو صحیح یا اچھا سمجھا ہے تو صرف اس بنا پر کہ مجھے اس کو صحیح یا اچھا  
سمجھا ہونگا خواہ بعد کو وہ اس لائق ثابت ہو یا نہ ہو۔ ایسا کہ نامیرے نزدیک  
عقل سلیم کا ایک بہت بڑا گناہ تھا۔

دوسرا فرض یہ تھا کہ حتیٰ الوسع اپنے اعمال میں ثابت قدمی سے  
 کام لوں حتیٰ کہ اگر کوئی شکوک، رائے بھی قائم کروں تو اس پر عامل ہونے  
 میں ایسی ہی مستعدی دکھاؤں جیسی کسی موقوف ترین رائے پر عمل کرنے  
 میں دکھاتا۔ اگر کوئی مسافر جنگل میں راہ بھول جائے تو اسے ادھر آدھری جنگل  
 نہ چاہئے۔ نہ یہ چاہئے کہ ہاتھ پاؤں ڈال دے اور اس کے لیے تدبیر بھی نہ  
 کہ ایک طرف رخ کرے اور چل کھڑا ہوتا کہ اگر منہل مقصود کو نہ بھی  
 پہنچے تو ایسی جگہ یا جائے جو بہر کیف پہنچ جنگل سے بہتر ہو یہی صورت  
 دنیا کے عمل کی ہے کیونکہ اس میں بھی اکثر سوچنے کا موقع نہیں آتا جب دریا  
 حق پر قدرت ہو تو دیکھنا چاہئے کہ ظن غالب کیا ہے اور جب متعدد ظنوں  
 میں غلبہ کسی کو نہ ہو تو بہر کیف کسی ایک کو ترجیح دیکر اس کے بموجب عمل  
 شروع کر دینا چاہئے اور پھر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے  
 جو کچھ طے کر لیا اس میں کوئی شک کا پہلو نہیں کیونکہ جس بنیاد پر ایسا انتخاب  
 یا فیصلہ عمل میں آیا ہے وہ خود صحت اور یقین سے مستند ہے چنانچہ  
 اس اصول پر قائم ہو جائے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ہمیشہ اس راستہ اور  
 اور نداشت سے بچا رہا جو ضعیف الارادہ اور مذہب طماع کے لوگوں کے  
 ضمیر کو ہمیشہ کشاکش میں مبتلا اور کیسولی سے محروم رکھتی ہے۔  
 تیسرا فرض میں نے یہ مقصد کیا کہ بجائے اس کے کہ اپنے مقدر  
 پر قابو پانے کی کوشش کروں اپنے نفس کو قابو میں لے آؤں اور بجائے  
 اس آرزو کو دل میں جگہ دینے کے کہ نظام عالم میرے لئے بدل جائے  
 خود اپنے خواہشات میں ترمیم قبول کر لوں بلکہ اپنے مزاج کو اس خیال کا  
 عادی کر لوں کہ بجز اپنے خیالات کے دنیا میں کوئی چیز اپنے قبضہ قدرت  
 میں نہیں۔ اور خارجی اشیا کا جہاں تک تعلق ہے جو مقصد پوری کوشش  
 کے بعد بھی نہ حاصل ہو سکے اسے اپنے لئے محال مطلق سمجھ لینا چاہئے  
 اسی اصول نے مجھے قناعت سکھائی اور نامکنات کی آرزو ترک کر دی  
 جو چیزیں انہم ممکن الحصول قرار دیتی ہے انہیں کو انسان و حور و ملائکہ ہے۔

جن چیزوں کو ہم اپنا پیدا کنشی حق سمجھنے لگتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں ان سے بلا تصور محروم رکھا ہے اگر ہم پہلے ہی سے ان چیزوں کو اپنی رسائی سے بعید قرار دے لیں تو اپنی محرومی پر اتنا افسوس بھی نہ آئے جتنا کہ ملک چین اور میکسیکو کی بادشاہت سے محروم رہنے پر ہو سکتا ہے۔ اگر مجبوری سے صبر کی توفیق ہو سکتی ہے تو بیماری میں صحت اور قید میں آزاد کی کی تمنا اس آرزو سے زیادہ ہونا چاہئے کہ کاش ہمارا جسم پارہ الماس کی طرح شفاف ہوتا یا پرندوں کی طرح پرواز کی طاقت ہم میں بھی ہوتی۔ البتہ ہر امر میں اس اصول کو برتنے کی عادت پیدا کرنے کے لیے مدتوں ذہن کی تربیت کرنا اور اکثر اوقات مراقبہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ میرے نزدیک قدیم فلاسفہ کی قوت کار از اسی میں مضمر تھا اور اسی چیز نے انھیں مال و دولت سے مستغنی کر دیا بلکہ فقر و فاقہ میں انکو وہ راحت نصیب ہوئی کہ جس پر ان کے خداوندوں کو بھی رشک آتا ہو گا۔ ان لوگوں کو اپنے اختیارات کے حدود پر غور کرتے کرتے یقین ہو گیا تھا کہ بجز اپنے خیالات کے کوئی چیز اپنے بس کی نہیں چنانچہ وہ وہ سری چیزوں کی آرزو ترک کر بیٹھے اور اپنے خیالات پر انکو وہ قدرت کاملہ حاصل ہوئی کہ اپنے کو سب سے زیادہ قوی دولت مند اور آزاد سمجھنے لگے اور خوش و خرم رہنے لگے۔ جن لوگوں کو اپنے مقدر سے سب کچھ میرے اگر وہ اس فلسفہ سے محروم ہیں تو انکی ہوا و ہوس انکو کبھی چین نہ لینے دیگی۔

اپنے دستور اخلاق کا مکمل کرنے کے لئے ضرورت ہوئی کہ اہل دنیا کے مشاغل پر بھی تبصرہ کروں تاکہ اپنے لئے کوئی مشغل پیدا کر سکیں دوسروں کے مشاغل پر حرف رکھنا میرا مقصد نہیں مگر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو مشغل اختیار کیا تھا ہی مجھے سب سے بہتر معلوم ہوا۔ میرا عقیدہ ہو گیا کہ مجھے سادگی عمر اپنے وضع کئے ہوئے طریقہ کے بموجب اپنی عقل کی تہذیب اور علم حقیقت کی تحصیل میں صرف کر دینی چاہئے۔ عمل درآمد کے



یہ خود ساختہ طریقہ بھی نہایت طمانیت بخش ثابت ہوا اور میں مان گیا کہ اس سے زیادہ مکمل اور سہل ضرور طریقہ نکلتا ناممکن ہے۔ اسی کی بدولت روزمرہ غیر معروف حقائق متکشف ہوتے گئے اور وہ شکیں میسر ہوئی کہ میں دنیا و مافیہا سے مستغنی ہوتا گیا۔ مذکورہ بالا اصول میں محض اپنی تربیت نفس جاری رکھنے کے لئے وضع کئے گئے تھے ورنہ دوسروں کی طرح مجھے بھی خدا نے کچھ عقل عطا فرمائی ہے اور حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہوں ورنہ کوئی وجہ اور نہ تھی کہ دوسروں کی رائے پر بغیر اپنی قوت فیصلہ پر زور دے ہوئے عمل کرتا نہ آتکھ بند کر کے دوسروں کی رائے پر مجبور نہ کرنا مجھے گوارا ہو سکتا تھا۔ اگر ان سے بہتر کوئی اصول نظر آئے اور سمجھتا کہ ان کے اختیار کرنے میں رحمت ہوگی تب تو ہرگز میں انہیں قبول نہ کرتا۔ مگر میں نے تو پہلے ہی اہم کر لیا تھا کہ جب خود اس لائق ہو جاؤنگا تو ان اصول کے جانچنے میں کمی نہ کرؤنگا۔ اگرچہ اگر میں یہ تدبیر نہ اختیار کرتا جس سے اپنی بساط پھر علم اور سعادت حقیقی حاصل ہوتے کی مجھے یوری امید تھی تو نہ تو میری خواہشات کی کوئی حد تھا ہوتی نہ طمانیت خاطر نصیب ہوتی۔ دل میں رغبت یا نفرت اسی لحاظ سے پیدا ہوتی ہے کہ عقل کسی چیز کو اچھا قرار دیتی ہے اور کسی کو برا۔ پس لازم آیا کہ وہ سب کچھ کے لئے ضروری چیز فیصلہ صحیح ہے۔ اور بہترین کردار کے لئے بہترین فیصلہ ضروری ہے۔ یہ وہ جو ہر ہے جس سے ساری خوبیاں لگے کل بے بہا چیزیں جو ممکن الحصول ہیں اور انسان کو فقاہت پسند بنادینے کے لئے کافی ہیں حاصل ہو سکتی ہیں میں نے ان اصول کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ اپنے عقائد ایمانی کے ساتھ جنہیں میں سب سے اعلیٰ و افضل سمجھتا تھا محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد یہ رائے قائم کی کہ اگر اب اپنے باقی ماندہ خیالات سے دست برداری شروع کر دوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے امید تھی کہ کچھ تنہائی میں (جہاں مجھے یہ تصورات حاصل ہوئے تھے) پڑے رہنے کی بجائے اگر نوع انسان سے

تعلقات رکھ کر اس کام میں مشغول ہوں تو زیادہ کامیابی ہوگی چنانچہ  
 موسم سرما کے ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے پھر سفر پر کمر باندھ دیا اور  
 نو سال تک بجز سیر و سیاحت کے کچھ نہیں کیا۔ یہ اس آرزو میں کہ  
 تماشہ گاہ عالم میں بجائے تماشہ گرینے کے تماشہ نگریوں۔ اب میں  
 نے اپنا فرض بنالیا کہ ہر معاملہ میں جہاں کہیں شک کو جائز طور پر دخل  
 دیا جاسکتا ہو یا خطا کا اندیشہ پایا جاتا ہو خاص غور و فکر سے کام لوں گا۔  
 اس طرح میرے ذہن میں جو باتیں خطایہ منہی تھیں وہ دور ہو گئیں۔ اس  
 سے یہ سمجھنا چاہئے کہ میں نے ان مشککین کی اتباع شروع کر دی تھی  
 جو ہر جگہ محض اس لئے شک کرتے ہیں کہ شک کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ  
 عدم یقین کے متلاشی رہتے ہیں۔ اور یہ انشاء اس کے بالکل عکس  
 یعنی تلاشی یقین ہے۔ جس یقین کو یا بمنزلہ ایک پختہ سطح یا چٹان کے  
 ہے جو گرد و غبار سے آلودہ ہے اور جس کو صاف کرنے کے لئے ان  
 فضول چیزوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے اپنے نزدیک اس  
 مقصد کو پورا کرنے میں کامیابی ہوئی۔ جن قضایا کو میں نے جانچا ان کا  
 غیر یقین یا مہی بر خطا ہونا معمولی خیال آرائیوں سے نہیں بلکہ صاف  
 اور موثق دلائل کے ذریعہ سے معلوم کیا اور مجھے کوئی بات نہیں ملی  
 جو اس درجہ مشکوک ہو کہ اس سے کوئی نتیجہ کافی وثوق کے ساتھ  
 نکل سکے۔ کیونکہ اگر اس سے اتنا ہی نتیجہ نکل آیا کہ اس میں کوئی شبہ  
 وثوق کا نہیں ہے تو یہی کیا کم ہے؟ جس طرح نیا مکان بنانے کے لئے  
 جب پرانا مکان ڈھایا جاتا ہے تو اس کا ڈھیر نی عمارت کے کام آنا  
 ہے اسی طرح جن تصورات کو لغو سمجھ کر میں مسترد کر چکا تھا انھیں کی بدولت  
 مجھے ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ جدید تصورات قائم کرنے میں  
 بہت مدد ملی۔ غرضیکہ میں اپنے طریقہ کے بموجب قدم اٹھاتا رہا اور بالعموم  
 اپنے خیالات کی تربیت اپنے اصول پر کرتا رہا۔ چند گھنٹے وقتاً فوقتاً  
 مسائل ریاضی حل کرنے میں صرف کرتا تھا نیز دوسرے علوم کے لئے بھی

کچھ وقت نکالتا تھا۔ اور رفتہ رفتہ جب ان علوم سے میں نے غیر موقوف  
 چیزوں کو خارج کر دیا تو ان کے مسائل بھی قریب قریب ریاضی ہی کے  
 مسائل ہو گئے۔ غرض کہ یوں میری زندگی ان لوگوں کی طرح بسر  
 ہونے لگی جو اپنا وقت خوش باشی اور معصومیت کے ساتھ گزارتے  
 ہیں اور شادمانی کو خباثت سے پاک رکھتے ہیں گو یا وہ شرافت کا  
 دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور انکی فرصت کا وقت بھی لطف  
 سے کٹتا ہے۔ اس عنوان سے میں اپنی جستجو میں منہمک رہتا تھا  
 جس سے مجھے بالآخر تلاش حقیقت میں وہ کامیابی میسر ہوئی جو محض  
 کتب بینی یا اہل علم سے تبادلاً خیالات کر کے نہ حاصل ہوتی۔  
 اس نوبرس کے عرصہ میں اس کی نوبت نہیں آئی کہ علما  
 میں جو مسائل مختلف فیہ ہیں انکی بابت کوئی مختصر فیصلہ کر سکتا یا کسی  
 فلسفہ میں اصول مروجہ سے زیادہ موقوف اصول کی تلاش شروع کرتا  
 کیونکہ ہر زمانہ کے بڑے بڑے عالی دماغ لوگ جو اس قسم کے تجسس  
 میں پڑ چکے ہیں ان کی مثالیں میرے پیش نظر تھیں اور میری رائے  
 قائم ہو چکی تھی کہ یہ لوگ بھی اس سٹی میں ناکام رہے۔ غرض کہ اس  
 امر کو میں اس قدر اہم سمجھ رہا تھا کہ اس قدر جلد اس طرف متوجہ بھی نہوتا  
 مگر عجب حسن اتفاق کہ اس نیت کو دل میں لانے سے پہلے ہی میرے  
 کانوں میں چہار جانب سے صدائیں آنے لگیں کہ اس تحقیق کو انجام  
 تک پہنچانے کا پہرا تیرے سر پہ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ لوگوں نے  
 یہ رائے کیونکر قائم کر لی۔ اگر میرے کسی قول سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے  
 تو اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ میں ہمیشہ اپنی بھیمانی  
 کا اعتراف بلا تکلف کرتا رہا اور کبھی کسی نظام فلسفہ کے پالی ہونے کا  
 مدعی نہیں ہوا۔ البتہ میں ان لوگوں کی روش سے ہمیشہ پرہیز کرتا  
 رہا ہوں جنہوں نے مطالعہ تو کم ہی کیا ہو گا مگر اپنے ان دلائل کے  
 اعلان میں بڑے شدد و مد سے کام لیا ہے جنہیں بہت سے لوگ

متیقن شمار کرتے ہیں اور میں انہی دلائل سے شک میں نہ گیا تھا  
 چونکہ مجھے طبعاً یہ گوارا نہیں تھا کہ میں جیسا ہوں لوگ مجھے اس سے  
 مختلف سمجھیں اس لئے میں نے یہ کوشش شروع کر دی کہ مجھے جو شہر  
 یوں حال ہو رہی ہے اپنے کو اس کا اہل بناؤں۔ غرض کہ آٹھ برس  
 ہوئے کہ اس خیال سے مجبور ہو کر اس ملک (ہالینڈ) میں مقیم ہوں  
 اور گویا ان مقامات سے کنارہ کش ہوں جہاں میرے شناسا اگر  
 میرے کام میں غلط انداز می کرتے۔ اطراف ملک میں جنگ و جدال  
 کا دور دورہ ہے اور حالات گرد و پیش کے لحاظ سے اس ملک کے  
 حدود میں اس قدر باضابطگی پائی جاتی ہے کہ یہاں جو فوج ہے وہ بھی  
 بقائے امن کے لئے ہے۔ لوگ چین سے بسیر کر رہے ہیں اور اپنے  
 کاروبار میں مصروف ہیں۔ ہر شخص کو اپنے کام کی اتنی فکر ہے کہ دوسروں  
 کے معاملات میں پڑنے کی فرصت ہی نہیں۔ جو سہولتیں کسی بارونق  
 شہر میں میسر ہو سکتی ہیں سب یہاں موجود ہیں۔ اور پھر بھی مجھے ایک  
 تنہائی اور گوشہ نشینی کا ساطف حاصل ہے جو بھر کسی دور و دراز  
 بیابان کے کہیں حاصل نہ ہو سکتا۔

## حصہ ہمارم

میں نہیں سمجھتا کہ مجھے اپنے ابتدائی تفکرات کے اُن نتائج کے ذکر سے جو امور زیر بحث سے متعلق ہیں اس موقع پر کوئی فائدہ ہے کیونکہ یہ نتائج مابعد الطبیعیات سے اتنا گہرا تعلق رکھتے ہیں اور اتنے غیر معمولی واقع ہوئے ہیں کہ ہر شخص کے لئے شاید قابل قبول ہوں تاہم اُن پر بحث کے بغیر بھی صورت مفر نہیں۔ کیونکہ یہاں پر سٹے کرنا یہ ہے کہ جو بنیادیں میں نے قائم کی ہیں کافی طور پر مستحکم ہیں یا نہیں۔ میں پیشتر کہہ چکا ہوں کہ بعض اوقات عملی ضروریات کے لئے ایسے امور کو بھی غیر مشکوک مان لینا پڑتا ہے جن کا غیر متیقن ہونا پہلے سے معلوم ہو۔ لیکن جب میں نے اپنی ساری توجہ تحقیق حقیقت میں صرف کرنا شروع کر دی تو سمجھ لیا کہ اب ضرورت اس کے بالکل برعکس عمل درآمد کی ہے اور چاہئے یہ کہ جن آراء میں ذرا بھی شک کی کنجائش نکل سکے اُنہیں غلط قرار دیکر یکدم مسترد کر دوں۔ تاکہ کم از کم اتنا تو محقق ہو جائے کہ آیا اسکے بعد جو کچھ عقائد آدھن میں باقی رہیں گے وہ مطلقاً ناقابل شک ہوں گے یا نہیں۔ چونکہ میں نے دیکھا کہ بعض اوقات حواس و حوکہ دیتے ہیں۔ اسلئے فرض کر لیا کہ حواس کے واسطے سے جو کچھ ذہن میں آتا ہے اُس کی سی کوئی جبرئی الواقع موجود نہیں ہوتی۔ اسی طرح انسان سے قیاسات میں بھی غلطی ہوتی ہے اور سہل سے سہل مسائل ہند سے میں مغالطہ



ہو جاتا ہے پس میں نے دوسروں کی طرح خود کو بھی غلطی مان لیا ہے اور ان تمام قیاسات کو جنہیں اب تک میں بمنزلہ اپنے استدالات کے سمجھے ہوئے تھا غلط شمار کر کے مسترد کر دیا۔ پھر جب غور کیا کہ جو خیالات (احضارات) بیداری میں تجربہ میں آئے ہیں خواب میں بھی تجربہ میں آسکتے ہیں تو یہ فرض کر لیا کہ تمامی اشیاء (احضارات) جو بیداری میں ذہن میں آتی ہیں ان کی حقیقت بھی عالم رویا کے اکتسابات حواس سے زیادہ نہیں۔ لیکن معامیری نظر اس طرف پہنچی کہ میں جب ہر چیز کو بے اصل خیال کرنا چاہتا ہوں تو میں خود جو یہ خیال کر رہا ہوں سمجھ نہ کچھ ضرور ہوں اور یہ حقیقت کہ ”میں خیال کرتا ہوں لہذا میں ہوں“ جو اس قدر موثق اور ایسی شہادت پر مبنی ہے کہ شکلی سے شکلی لوگ بھی اس میں کوئی شک کی علت نہ لگا کر اس کی اہمیت نہ گھٹا سکیں گے۔ پس میں نے طے کر لیا کہ جن اصول فلسفہ کی مجھے تلاش تھی انہیں سب سے پہلا درجہ میں اسی حقیقت کو دوں گا اور اس کو بلا تکلیف مان لوں گا۔ پھر میں نے یہ تحقیق شروع کی کہ میں کیا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ اگر چاہوں تو فرض کر سکتا ہوں کہ میرے جسم نہیں ہے دنیا بھی نہیں ہے نہ دنیا میں کوئی جگہ ہے جس میں ہو سکوں۔ لیکن میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ میں خود نہیں ہوں۔ یہی امر کہ دوسری چیزوں کی حقیقت میں مجھے شک کا خیال پیدا ہوتا جائے خود اس صاف نتیجہ کا یقین دلانا تھا کہ میں ہوں۔ حالانکہ دوسری طرف اگر میں نے خیال کرنا صرف موقوف ہی کر دیا ہوتا تو یہ باور کرنے کی کوئی وجہ میرے پاس نہیں ہوتی کہ میں موجود ہوں خواہ دوسری چیزیں جو کبھی میرے خیال میں آچکی تھیں۔ موجود ہی کیوں نہ ہوتیں۔ پس اسی سے میں نے اخذ کیا کہ میں وہ ہوں جس کا سارا جوہر یا فطرت خیال کرنے میں مضمر ہے۔ اور جس کا موجود ہو سکتا نہ کسی جگہ پر منحصر ہے نہ کسی مادی چیز پر جس کی ”میں“ یعنی وہ ذہن کہ میں جو کچھ ہوں اسی کی وجہ سے ہوں میرے

جسم سے مختلف ہے۔ اور یہ نسبت جسم کے زیادہ آسانی سے علم میں آتا ہے۔ اور بغیر جسم کے بھی یقینہ پائی رہ سکتا ہے۔

اس کے بعد عام طور پر میں نے اس کی تحقیق شروع کی کہ کسی قضیے کی صداقت اور وثوق کے لوازم کیا ہیں۔ چونکہ مجھے ایک قضیہ ایسا دریافت ہو گیا تھا جس کی صداقت میرے علم میں آچکی تھی لہذا خیال ہوا کہ اس کی صداقت اور وثوق کی علت بھی دریافت ہو جائے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ ”میں خیال کرتا ہوں لہذا میں ہوں“ ان الفاظ میں کوئی چیز ایسی نہیں جن سے اس کی صداقت یقین ہوتی ہو۔ مگر مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ خیال کرنے کے لئے موجود ہونا لازمی ہے۔ پس میں نے ایک قاعدہ کلیہ اور نتیجہ عام کے طور پر مان لیا کہ جو کچھ بالکل صاف اور ہمیشہ طور پر ہمارے تصور میں آتا ہو وہ برحق ہے۔ البتہ جو چیزیں صاف اور ہمیشہ طور پر ذہن میں آتی ہیں ان کی شناخت قدر سے دشوار ضرور ہے۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ چونکہ میں شک میں مبتلا تھا اس لئے میرا وجود ہمہ وجوہ کامل نہ تھا۔ کیونکہ مجھے صاف طور سے واضح ہو چکا تھا کہ علم بمقابلہ شک کے اعلیٰ کمال پر دلالت کرتا ہے۔ اب جب میں نے یہ تحقیق شروع کی کہ مجھے اپنے سے زیادہ کامل شے کا خیال کیونکر ہوا تو میں نے صاف طور پر تمیز کر لیا کہ یہ تصور مجھے کسی ایسی فطرت سے حاصل ہوا ہے جو درحقیقت کامل تر ہے۔ اس کے بعد خارجی اشیاء مثلاً آسمان زمین روشنی گرمی وغیرہ کی بابت دریافت کرنا آسان ہو گا کہ یہ کہاں سے آئیں۔ بظاہر ان میں کوئی بات نہ تھی جو یہ مجھ سے ارفع قرار پائیں۔ لہذا میں نے یقین کر لیا کہ اگر ان کی کوئی حقیقت ہے تو جہاں تک میری فطرت میں کمال کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے ان کا دار مدار میری ہی فطرت پر ہے۔

اور اگر یہ بے حقیقت ہیں تو میں نے انہیں کہیں سے نہیں پایا  
 بلکہ یہ اس وجہ سے لاحق ہو گئیں کہ میری فطرت میں کمال کی کوئی نہ  
 کوئی تخی موجود تھی۔ لیکن یہ صورت کسی ایسی فطرت کے تصور سے  
 وابستہ نہیں ہو سکتی جو مجھ سے زیادہ کامل ہو۔ کیونکہ جس طرح کوئی شے  
 لاشے سے نہیں پیدا ہو سکتی اسی طرح کامل تر شے کمتر کمال والی شے  
 سے نہیں پیدا ہو سکتی۔ پس یہ ناممکن ہے کہ یہ تصور مجھ میں اپنی ذات  
 سے پیدا ہوا ہو۔ بلکہ یہ مجھے ایسی فطرت نے عنایت کیا ہے جو میری  
 فطرت سے زیادہ کمال رکھتی ہے اور جو کچھ صفات کمالیہ میرے ذہن  
 میں آسکتے تھے سب انہیں موجود ہیں۔ ایک لفظ وہ فطرت ”خدا“ ہے  
 یہاں پر میں اتنا اضافہ اور کرتا ہوں کہ میرے ذہن میں ایسے کمالات  
 بھی ہیں جن سے میری ذات متصف نہیں۔ لہذا وہ فقط میری ہی ذات  
 نہیں جو موجود ہو بلکہ میرے سوا کوئی کامل تر ہستی بھی ہے جس پر میرے  
 وجود کا دار و مدار ہے اور جو کچھ میرا ہے وہ میں نے اسی سے  
 پایا ہے۔ اگر صرف میرا ہی وجود ہوتا جو دوسری ہستی سے مستغنی  
 ہوتا اور جو کچھ شان کمال مجھ میں ہے اگر مجھے اپنی ہی ذات سے  
 حاصل ہوئی ہو تو مجھ میں یہ صلاحیت بھی ہوتی کہ اپنے کمال میں  
 جو کمی محسوس کر رہا ہوں اسے خود سے پورا کر لوں۔ اور اپنی ذات  
 کو لامتناہی، قدیم غیر متغیر، علامہ اکمل اور قادر مطلق بنا لوں۔ گویا جو  
 صفات کمالیہ میں خدا کی بابت تصور کر سکتا تھا خود اپنی ذات  
 میں پیدا کر سکتا تھا۔ خدا کی فطرت (جس کا وجود ثابت کر چکا ہوں)  
 دریافت کرنے میں میری فطرت صرف یہ غور کرنے کی اجازت  
 دیتی تھی کہ آیا ان اعلیٰ خواص سے متصف ہونا جن کا کوئی تصور  
 میرے ذہن میں آسکتا ہے کمال کی نشانی ہے یا نہیں۔ یہ متیقن  
 تھا کہ جو وصف کسی عدم کمال پر دلالت کرے وہ خدا کا وصف نہیں  
 ہو سکتا۔ اور باقی کی اسکو کمی نہیں۔ پس اس امر کا اور اک ہوا کہ شک

”بے ثباتی“ رنج و غیرہ کی سی چیزیں خدا کے لئے نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ وہ چیزیں ہیں کہ اگر میں ان سے مبرا ہو جاؤں تو مجھے پیرا ہو جائے۔ علاوہ ازیں بہت سی قابل الحس اور جسم رکھنے والی چیزوں کے تصور ابھی مجھے حاصل تھے اگرچہ میں فرض کر سکتا تھا کہ یہ سب خواب ہی خواب ہیں (یعنی میرے محسوسات و خیالات سب باطل ہیں) مگر پھر بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ یہ تصورات درحقیقت میرے تخیل میں موجود ہیں۔ لیکن چونکہ مجھے نہایت مہینہ طور پر خود محسوس ہو گیا کہ فطرت ذہنیہ فطرت جسمانیہ سے مختلف ہے اور جیسا کہ میرے مشاہدہ میں آچکا ہے، ترکیب انحصار پر دلالت کرتی ہے اور انحصار صریحاً ایک عدم محال کی صورت ہے پس میں نے طے کر لیا کہ خدا کا ان دو فطرتوں سے مرکب ہونا اس کے کمال کی نفی کرے گا۔ لہذا خدا اس طور سے مرکب نہیں۔ عالم کے سارے اجسام و اذہان، یا اور بھی جو فطرتیں کمال سے قالی ہوں اپنے وجود کا انحصار تمام تر خدا کی قدرت پر رکھتی ہیں یعنی از خود ایک لحظہ بھی باقی نہیں رہ سکتیں۔

اب میں براہ راست دوسرے حقائق کی جستجو میں مصروف ہوا۔ میرے نزدیک ارباب ہندسہ کا مسلح نظریہ تھا کہ ایک ایسی مسلسل جسمیت یا فضا کا تصور پیدا کر لیا جائے جو طول و عرض و عمق میں غیر محدود طور پر وسیع و ممتد ہو اور مختلف حصوں میں تقسیم ہو کر مختلف شکلیں اور مختلف قد و قامت اختیار کر سکتی ہو بلکہ طرح طرح سے حرکت میں بھی آسکتی ہو۔ اس تصور کا عادی بننے کے بعد میں نے ہندوین کے بعض سلیس ترین استدلالات پر نظر ڈالی اور مشاہدہ کیا کہ جس اعلیٰ پایہ کا وثوق ان کے طرز استدلال سے بالاتفاق منسوب کیا جاتا ہے اس کی اصلیت یہ ہے کہ اس میں صاف طور سے وہی قواعد پنہاں ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مگر مجھے اسکا بھی ادراک ہوا کہ اس استدلال میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے انکے

مذکورہ بالا سطح نظر کا موجود یا اصلی ہونا متیقن ہو سکے۔ مثلاً ایک مثلث ہے جس سے میں نے واضح طور پر تمیز کر لیا کہ اس کے تینوں زاویے ملکر دو زاویہ قائمہ کے برابر ہیں۔ مگر ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جس سے اس مثلث کے وجود کا بھی یقین ہو سکے۔ لیکن جب وجود کامل کو جانچتا ہوں تو اس کے برخلاف یہ پاتا ہوں کہ خود اس کے تصور ہی میں اس کا وجود اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ صاف طور پر مضمر ہے جیسے مثلث کے تصور میں تینوں زاویوں کا دو زاویہ قائمہ کے برابر ہونا۔ یا کسی کردہ کے تصور میں اس کے ہر نقطے کا مرکز سے مساوی الفاصل ہونا۔ اور یہ امر کہ خدا (یعنی یہی وجود کامل) ہے یا موجود ہے اُسے قدر متیقن ہے جس قدر کہ علم ہندسہ کا کوئی استدلال ہو سکتا ہے۔

لیکن بہت سے لوگ اس حقیقت سے آگاہی حاصل کرنے اور اپنے ذہن کی حقیقت سے آگاہ ہونے میں کچھ دشواری محسوس کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو سطح محسوسات سے بلند کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اور بجز ایسے تخیل سے کام لینے کے جو مادی اشیاء کے دائرے میں محدود رہنے والے تفکرات کی ایک صورت ہے کسی ارفع شے پر عقل دوڑانے کی عادت سے محروم ہیں۔ حتیٰ کہ جو کچھ ان کے سے تخیل کی حد پر وازہ سے بالاتر ہے انکو بعید از عقل معلوم ہوتا ہے۔ اس امر واقعہ پر اسی سے کافی روشنی پڑتی ہے کہ مدرسہ بطور ایک اصول کے ماننے ہوئے ہیں کہ فہم میں کوئی چیز ایسی نہیں آ سکتی جو پہلے حواس میں جاگزیں نہ ہو چکی ہو۔ لیکن خدا اور روح کے سے تصورات تو ہرگز کسی حاسہ کی مدد سے نہیں حاصل ہوئے ہیں اور پھر بھی فہم ان کو قبول کرتی ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ جو لوگ ان تصورات کو قبول کرنے کے لئے اپنی قوت تخیل سے بھی کام لیتے ہیں ان کا یہ فعل ایسا ہی ہے جیسے آواز سننے



اور بوسو گھسنے کے لئے اپنی آنکھوں سے کام لینے کی کوشش کی جاتی  
حالانکہ جہاں تک نفس متیقن کا تعلق ہے قوت یا صبرہ میں وہی بات  
موجود ہے جو قوت سامعہ میں ہے۔ مگر واقعہ تو یہ ہے کہ جب تک ہم  
سے مدد نہ لی جائے نہ تو کسی حالت کے ذریعہ سے متیقن حاصل ہو سکتا  
ہے نہ قوت متحدہ کے ذریعہ سے۔

پھر بھی اگر ایسے لوگ ہیں جو خدا اور روح کے کافی طور پر  
قائل نہیں تو میں چاہتا ہوں کہ وہ سیدھی توجیہ پر نظر کر کے  
معلوم کر لیں کہ اس قسم کے قضایا ایسے ہیں جنہیں ایک جسم کر سکتے  
ہیں "ستارے اور زمین موجود ہے" وغیرہ۔ شاید زیادہ  
یقینی سمجھتے ہوں ہرگز اس لئے یقینی نہیں۔ گوان امور کی بابت ایک  
عملی یقین ضرور حاصل ہے اور وہ اس قدر شدید ہے کہ ان کے  
وجود میں شک کرنا گواہ ایک غلو کی سی شان رکھتا ہے۔ لیکن جب  
سوال کا تعلق مابعد الطبیعیاتی یقین سے ہو تو سوا اس کے  
جس کی عقل میں قور ہو کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس مشاہدہ  
کے ضمن میں یقین کامل سے احتراز کرنے کے لئے کافی وجوہ موجود  
ہیں۔ کیونکہ حالت خواب میں یہاں تک ممکن ہے کہ ہم اپنے کو  
کسی اور جسم میں سمجھنے لگیں یا دوسری زمین اور دوسرے ستارے  
دیکھنے لگیں اور اصلیت اس کی کچھ نہ ہو۔ یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ  
نہیں کہ جو خیالات خواب میں آتے ہیں بیداری کے خیالات کے  
مقابلہ میں باطل ہیں۔ کیونکہ اول الذکر بھی اکثر اچانک اور واضح ہونے  
میں موخر الذکر سے کچھ کم نہیں ہوتے۔ بلکہ برعکس عقلاء یقینی چاہیں  
اس مسئلہ پر دماغ پاشی کیا کریں، مگر میں نہیں سمجھتا کہ جب تک پہلے خدا  
کے وجود کے وہ قائل نہ ہوں ایسی کوئی بھی توجیہ کر سکتے ہیں۔  
یہ شک رفع ہو سکے۔ کیونکہ اول تو وہ اصول رکھتے ہیں جو صحت  
اور معیار طور پر تصور میں آسکتی ہیں جس کو میں نے بطور ایک کلیہ

مانا ہے صرف اسی بنا پر پایہ یقین کو پہنچا ہے کہ خدا کا وجود ہے۔  
 بلکہ اس بنا پر کہ اس کی ذات کامل ترین ذات ہے اور ہم نے  
 جو کچھ پایا اسی سے پایا۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے تصور است اور  
 خیالات اپنی صفائی اور تمیز کی حد تک حقیقی ہیں اور جس حد تک  
 وہ خدا کی طرف سے ہیں اسی حد تک ان کی صداقت بھی  
 ہے۔ اب جو خیالات اور تصورات اکثر غلطیوں سے ملو ہوئے  
 ہیں تو اسکی وجہ یہ ہے۔ ان میں کسی قدر ابہام یا پرانندگی پائی جاتی  
 ہے جس کے تناسب سے ان کا وجود لائے پر محول ہوتا ہے، اور اس  
 پرانندگی کی علت ہمارا عدم کمال ہے۔ ظاہر ہے کہ باطل یا عدم کمال  
 کا (یعنی جس حد تک کہ وہ عدم کمال ہے) خدا کی جانب سے ہونا  
 اس سے کچھ کم مہل نہیں جتنا کہ حق یا کمال کا لائے سے ناشی ہونا۔  
 لیکن اگر ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ حقیقت اور صداقت میں سے جو کچھ  
 ہمیں میسر ہے ایک اکمل اور غیر محدود ہستی کی طرف ہے تو پھر  
 ہمارے تصورات خواہ کتنے ہی صاف اور تمیز کیوں نہ ہوں ہمارے  
 پاس یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ موجود نہ ہوگی کہ ان میں صداقت کا سا  
 کمال موجود ہے۔

لیکن جب خدا اور روح کے علم نے اس قاعدہ کو متیقن کر دیا  
 تو باپسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ جو خیالات اثناء بیداری میں گھر میں  
 آئے ہیں ان میں عالم خواب کے التباسات خواص کے خوف سے  
 ذرا بھی شک نہ کرنا چاہئے۔ فرض کرو کہ کسی شخص نے خواب ہی میں  
 کوئی مہینہ تصور پیدا کیا مثلاً کسی مہینہ میں نے خواب میں کوئی نیا استدلال  
 پیدا کر لیا تو محض حالت خواب میں ہونا اس کی صحت کے منافی  
 نہ ہوگا۔ ہمارے عالم خواب میں بڑا عجیب تو یہ ہے کہ اس میں بھی  
 سب چیزیں اسی طرح تجربہ میں آتی ہیں جیسے وہ اس خارجی کے  
 ذریعہ سے عالم بیداری میں نظر آئیں۔ مگر اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں

کیونکہ یہی تو بات ہے جس سے دنیا نے حواس کے تصورات کی صداقت میں جائز طور پر شک پیدا ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات بیداری میں بھی اسی طرح حواس غلطی کر سکتے ہیں۔ مثلاً یرقان کے مرض میں ہر چیز زرد دکھائی دیتی ہے اور دور کی چیزیں مثلاً آسمان کے تارے اپنے قد و قاست سے ہمیشہ چھوٹے نظر آتے ہیں۔ غرض کہ بیداری ہو یا خواب، جب تک کہ عقل گواہی نہ دے کسی چیز کی صداقت کا قائل نہ ہونا چاہئے۔ واضح رہے کہ یہ عقل کی بابت کہہ رہا ہوں نہ کہ تخیل یا حواس کی بابت۔ مثلاً ہم آفتاب کو نہایت صاف طور پر دیکھتے ہیں مگر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی جسامت اتنی ہی ہے جتنی کہ ہمارے حواس بصارت سے معلوم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے تخیل میں نہایت مزین طور پر شیر کاسر بکری کے جسم میں لگا ہوا پائیں اور پھر بھی اس نتیجہ کے پابند نہ ہوں کہ ایسی مخلوق کا وجود ہے کیونکہ عقل کچھ اُسکو لازمی قرار نہیں دیتی کہ جو چیز اس طرح پردہ کھائی دے یا تخیل میں آئے وہ حقیقت ہو جو وہ بھی ہوگی۔ عقل تو صرف یہ کہتی ہے کہ ہمارے تصورات اور تخیلات میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے۔ ورنہ یہ ممکن نہیں کہ خدا کی ذات جو صداقت اور کمال میں پوری ہے، ان تصورات و تخیلات کو ہمارے ذہن میں پیدا کرتی۔ اب چونکہ خواب میں کوئی استدلال اُس قدر صاف اور مکمل نہیں ہوتا جتنا کہ بیداری میں { اگرچہ بعض اوقات خواب کے افعال تخیل یا جاگرن اور وضاحت میں حالت بیداری کے افعال سے اگر زیادہ نہیں تو مساوی ضرور ہوتے ہیں } اس لئے عقل کا حکم یہ بھی ہے کہ گو ہمارے جزئی عدم کمال کی وجہ سے ہمارے تمامی تخیلات سچے نہیں ہو سکتے تاہم جن تخیلات میں صداقت ہے انھیں بلا اشتباہ بمقابلہ حالت خواب کے اوقات بیداری کے تجربات میں آنا چاہئے۔

# چشم

ان مبادیات سے جو حقائق میں نے مستبط کئے تھے اُن کا سارا سلسلہ میں یہاں بالکل واضح کر دیتا لیکن ابھی میں اُن مباحث میں نہیں پڑنا چاہتا جو علما میں مابہ النزاع ہیں اور اُن سے احتراز ہی نسب ہے۔ البتہ یہاں مجملاً یہ بیان کرونگا کہ وہ حقائق کیا ہیں تاکہ اہل فہم اندازہ کر سکیں کہ اگر اُن کا ذکر مزید خصوصیت کے ساتھ کیا جائے تو مفاد عامہ کے لئے کہاں تک مناسب ہے۔ میں اپنے اس ارادہ پر ہمیشہ ثابت قدم رہا ہوں کہ جس اصول سے میں نے وجود باری اور وجود روح کے ثبوت میں کام لیا ہے اُس کے علاوہ کوئی اصول نہ مانونگا اور جس طرح ارباب ہندسہ کے استدالات مجھے صاف اور موثق نظر آتے تھے تاوقتیکہ کوئی شے اُس سے صاف اور موثق نہ نظر آئے اُس کو برحق تسلیم نہ کرونگا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اکثر دشواریاں جو عموماً فلسفہ میں زیر بحث رہا کرتی ہیں اُن کی طرف سے اپنے کو مطمئن کرنے کے وسائل میں نے غور می ہی مدت میں پیدا کر لئے بلکہ چند اُن قوانین سے بھی باخبر ہو گیا جنہیں خدا نے عالم میں نافذ کیا ہے۔ اور جن کی بابت ہمارے ذہن میں ایسے تصورات راسخ کر دئے ہیں کہ غور کرنے پر اُن قوانین کا جملہ موجودات و واقعات عالم میں نافذ ہونا بالکل متیقن ہو جاتا ہے۔ مزید برآں ان قوانین کے باہمی تعلق پر غور کرنے سے

مجھے بعض ایسے حقائق بھی دریافت ہو گئے جن کا علم حقائق کی جملہ سابقہ معلومات کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہم اور کارآمد ہے۔

لیکن چونکہ ان انکشافات میں سے غیاث خاص کو شائع کرنے کے لئے میں نے ایک الگ رسالہ کی صورت میں قلمبند کر لیا ہے (جس کی اشاعت میں بعض امور حائل ہیں) لہذا میں اپنے نتائج افکار کو بغیر اس کے سہولت سے نہیں ظاہر کر سکتا کہ اس رسالہ کا خلاصہ مطلب یہاں بیان کر دوں۔ اس سلسلہ میں قدم اٹھانے سے پہلے میری نیت یہ تھی کہ جو کچھ ادوی چیزوں کی فطرت کے بارے میں میں نے اپنے نزدیک معلوم کیا ہے اس سب کو یکجا کر دوں مگر مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اس رسالہ میں اپنے ذہن کی کل کائنات نہ درج کر سکوں کیونکہ میرے پیش نظر اس تصور کی مثال ہے جو ہموار سطح پر تصویر بناتا ہے تو اپنے موضوع تصویر کے صرف دو ہی ایک پہلو روشن کر سکتا ہے اور باقی ہر پہلو کو اگر ظاہر کر سکتا ہے تو صرف اس حد تک کہ جب تصویر کے نمایاں حصہ پر نظر پڑے تو انکی جھلک بھی نظر آ جائے پس میں نے نتیجہ کر لیا کہ صرف "روشنی" کا ایک موضوع اختیار کروں گا اور اس پر کافی طوالت کے ساتھ بحث کروں گا۔ یعنی اسی ضمن میں آفتاب اور ثوابت کی بابت کچھ اضافہ کرنے کا موقع مل جائے گا کیونکہ روشنی تقریباً تمام تر اشیاء سے ناشی ہوتی ہے۔ افلاک پر انھیں سے پہنچتی ہے اور سیاروں، باد و آسمانوں اور زمین پر انھیں سے آتی ہے۔ علی الخصوص وہ تمام اجسام جو یا تو زمین ہیں یا شہات یا روشن انھیں سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور بالآخر پھر وہی روشنی انسان تک پہنچتی ہوتی ہے جو ان چیزوں کا دیکھنے والا ہے۔ اس کے بعد اس غرض سے کہ یہ تیسری مضامین کسی حد تک پس پشت پر جائے اور ان چیزوں کی بابت اپنی رائے (علمائے اتفاق یا اختلاف کے بغیر) نہایت آدوی سے ظاہر کر سکوں میں نے



ارادہ کر لیا کہ سب کو یہیں پر اپنے اپنے اختلافاً میں مبتلا چھوڑ کر یہ ذکر  
 پھیر دوں کہ اگر ان خیالی تضادوں میں خدا کوئی اور دنیا پیدا کرے جس میں  
 مادہ کی مقدار کافی رکھے اور مادہ کے مختلف اجزاء میں مخالف اور  
 پیراکنہ گی پیدا کر دینے والا ایک اضطراب والہ ہے، حتیٰ کہ اس وجہ  
 انتشار اور بد نظمی پیدا ہو جائے کہ کسی شاعر کے وہم و گمان میں بھی  
 نہ آئی ہو اور پھر وہ اس سے زیادہ کچھ فکر کے کہ فطرت کو اپنی معمولی  
 منظور کی بخش کر اس کے حال پر چھوڑ دے کہ وہ خدا داد قوانین کے  
 بموجب اپنا کام کرتی رہے تو ایسی صورت میں کیا ہو گا۔ ۹ اس مفروضہ  
 کے ماتحت میں نے اول تو اس مادہ کا ذکر کیا جس سے ظاہر ہوتا تھا  
 کہ پھر ان امور کے جو خدا اور روح کے بارے میں بیان ہو چکے ہیں  
 میرے نزدیک اس سے زیادہ صاف اور سمجھ میں آنے والی کوئی چیز  
 نہیں ہو سکتی۔ میں نے غامض لحاظ کر لیا تھا کہ مادہ کی ان صورتوں یا اوصاف  
 میں سے ایک بھی مادہ میں موجود نہیں ہیں جن کی بابتہ درس گا ہوں میں  
 اس قدر قلیل و قائل جاری ہے کہ نہ اور کوئی ایسی بات پائی جاتی ہے جو  
 توہین انسانی کے لئے اتنی اذیت دہی ہو کہ کوئی شخص خود کو اس سے  
 نا بلند خیال کر سکے۔ علاوہ بریں میں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ قوانین  
 فطرت کیا ہیں اور اپنے دلائل کو محض اس اصول پر قائم کیا ہے کہ  
 ذات پاری کے کمال کی کوئی انتہا نہیں اس پر پیرا پیرا چل کر جن قوانین میں  
 ذرا بھی شک کی گنجائش تھی ان کو منکشف کرنے کی کوشش کی ہے  
 اور ثابت کیا ہے کہ خدا نے اگر دوسرے عالم بھی خلق کئے ہوتے  
 تو ان میں کوئی عالم ایسا نہ ہوتا جس میں یہ قوانین نافذ نہ ہوں پھر یہ دکھایا  
 ہے کہ اس حالت میں بھی مادہ کے جزو اعظم کو لا محالہ ان قوانین کے  
 بموجب ایک مرتب اور منظم صورت اختیار کرنی ہو گی اور اس اعتبار میں  
 اس کے بعض اجزاء لازمی طور پر زمین کی صورت اختیار کر لیں گے بعض  
 دھندار ستاروں اور سیاروں کی۔ اور پانی اوقاب اور ثوابت کی شکل

بنجائیں گے۔ چنانچہ اس ضمن میں میں نے جوہر مکان، حرکت و نیز  
 آسمان اور ستاروں کے خواص کے بابت بہت کچھ اضافہ کیا اور اس  
 امر پر بھی بہت کچھ کہہ ڈالا کہ موجودہ نظام عالم کے آسمان اور ستاروں  
 میں کوئی لائق مشاہدہ شے ایسی نہیں جو نظام زیر بحث کے آسمان اور  
 ستاروں میں بالکل اسی طرح پر نہ ہوگی۔ یا یہ کہ جس کا نہ پایا جانا ممکن ہوگا  
 پھر میں نے زمین کا ذکر شروع کیا اور اس ضمن میں خاص کر یہ فرض کر لیا  
 کہ جس مادہ سے زمین کی ترکیب ہوئی ہے خدا نے اس کے اجزاء میں  
 وزن نہیں پیدا کیا ہے اور اسی کے ساتھ میں نے یہ دکھایا ہے کہ زمین  
 کے اجزاء کو اس کے مرکز صیح کی جانب مائل ہونے سے کوئی امر  
 مانع نہیں ہو سکتا۔ اس کی سطح پر پانی اور ہوا ہے تو کیونکر آسمان اور اجرام  
 فلکی خاص کر مانتاب کے اثر سے مدوجزر کی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا  
 مشاہدہ ہم اپنے سمندروں میں کرتے ہیں۔ نیز پانی اور ہوا دونوں کا ایک  
 خاص سیلان جو مشرق سے مغرب کی جانب منطقہ حارہ میں نمایاں ہے  
 پیدا ہوتا ضروری ہے، اور پھر پہاڑوں، سمندروں، چشموں اور دیو کا  
 پیدا ہونا بھی قدرتی شے ہے۔ جمادات جو کانوں سے نکلتے ہیں نباتات  
 جو زمین سے اگتی ہیں اور عام طور پر وہ اجسام جو موتلف یا مرکب کہے  
 جاتے ہیں کیونکر وجود میں آتے ہیں۔ مذکورہ بالا دریافت شدہ چیزوں  
 میں ستاروں کو چھوڑ کر سوائے آگ کے کوئی چیز نظر نہیں آتی جس سے  
 روشنی پیدا ہوتی ہو۔ پس میں نے آگ کی سرشت کی بابت جو کچھ ممکن  
 تھا یعنی اس کے پیدا ہونے اور قائم رہنے کے اسباب وغیرہ دکھائے  
 اور اس کی بھی توجیہ کی کہ روشنی بغیر حرارت کے اور حرارت بغیر روشنی  
 کے کیونکر موجود ہو سکتی ہے اور مختلف اجسام میں حرارت سے انواع  
 و اقسام کے رنگ اور دیگر حالات کیونکر پیدا ہوتے ہیں۔ اگر بعض اجسام  
 کو وہ رقیق تو بعض کو منجمد کیونکر کر دیتی ہے اور تقریباً ہر جسم کو خاکستر اور  
 دھواں کیونکر بنا سکتی ہے۔ نیز بالآخر وہی پھر اس خاکستر سے محض

اپنے فعل کی شدت کو بڑھا کر شیشہ تیار کر دیتی ہے۔ خاکستر کا شیشہ کی صورت میں تبدیل ہو جانا اس قدر حیرت انگیز معلوم ہوا کہ اس کی نظیر لانا مشکل ہے اور اسی وجہ سے مجھے اس بیان میں خاص دلچسپی ہوئی۔ مذکورہ بالا اسباب کی بنیاد میں اس نتیجہ کی طرف مائل نہیں ہوا کہ عالم اسی طرح خلق ہوا ہے جیسے کہ میں نے بیان کیا۔ فریہ زیادہ تر یہی ہے کہ عالم کو جس طرح پر ہونا تھا خدا نے اس کو اسی طرح پر کر دیا۔ مگر یہ رائے کہ جس فعل سے خدا عالم کی تربیت یا پرورش کرتا ہے وہ وہی فعل ہے جس سے عالم خلق ہوا ہے یقیناً صحیح اور دینیات والے بھی عام طور پر یہی خیال کرتے ہیں۔ اولاً خدا نے عالم کو بجز عدم نظم کے کوئی صورت نہیں بخشی تھی۔ صرف چند قوانین فطرت مقرر کر دئے تھے اور اپنی منظوری بخش دی تھی کہ جو رفتار اس کی اب نظر آتی ہے شروع ہو جائے اور ہم معجزہ تخلیق پر حیرت رکھے بغیر مان سکتے ہیں کہ خالص مادی اشیا امتداد زمانہ سے ایسی بن گئی ہیں جیسی کہ میں اب نظر آتی ہیں۔ ان چیزوں کا ایک دم سے مختتم اور مکمل صورت میں پیدا ہونا ان کی فطرت کو دیکھتے ہوئے اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا جیسا کہ ان کا تدریج معرض وجود میں آنا۔

غیر ذی روح اجسام اور نباتات کے بیان سے گذر کر میں نے حیوانات اور خاص کر انسان کا ذکر شروع کیا۔ چونکہ اب تک مجھے کافی واقفیت نہ تھی کہ میں اس موضوع میں بھی معلومات کو علتوں سے مستبط کر کے بحث کرتا اور دکھاتا کہ ان چیزوں کو وجود میں لانے کیلئے فطرت کس طرح پر مجبور تھی اس لئے محض اس مفروضہ پر اکتفا کر لی کہ انسان کے کالبد کو مع اس کی ظاہری شکل اور اعضا کی اندرونی موافقت کے اسی مادہ سے جس کا ذکر کر چکا ہوں تیار ہو جو وہ نمونہ پر خدا نے بنادیا مگر اس کالبد میں نہ تو کوئی ذی عقل روح پنہانی نہ روح نباتی یا حیوانی روح کی جگہ پر کوئی اور شے اس کو ودیعت کی البتہ

قلب میں اس طرح کی آگوں میں سے ایک آگ ایسی پیدا کر دی  
جو بغیر روشنی کے ہوتی ہے۔ اور اس کا ذکر اس بیان میں ہے۔  
میرے نزدیک وہ آگ اس گہری سے مختلف نہیں جو گھاس کے ٹوہ  
میں گھاس کے خشک ہوئے ٹوہ سے قبل پائی جاتی ہے یا جو تازہ ٹھراہ  
تاب میں قبل ازیں کہ وہ صاف کیا جائے۔ یہ جان پیدا کرتی رہتی ہے  
کیونکہ اس مفروضہ کے رو سے جسم میں جس قسم کے وظائف جاری  
ہو سکتے ہیں جانچ کر سب کے سب ایسے نظر آئے جو تمام قوت  
فکری کے بغیر بھی پائی رہ سکتے ہیں اور روح کے وجود پر (یا بالفاظ دیگر  
ہمارے اس جزو پر جو جسم سے ممتاز ہے اور جس کی بابت کہا جا چکا  
ہے کہ وہ فطرۃً خاصہ فکر کے مراد ہے) ذرا بھی انحصار نہیں رکھتے  
یہ ان وظائف کا ذکر ہے جن میں غیر ذی العقول حیوانات جسم سے  
مشابہ ہیں اور انہیں مجھے کبھی ایسے وظائف نہ نظر آئے جو فکر پر مشتمل  
ہونے کے سبب سے محض انسان میں پائے جاسکتے ہوں۔ اور  
بعد کو میں نے ہوں ہی کہ خدا کا ایک ذی عقل روح کو خلق کرنا  
اور اسے اس جسم سے متعلق کرنا فرض کر لیا ہے ان وظائف کا  
دریافت کرنا کچھ مشکل نہ رہا۔

لیکن یہ دکھانے کے لئے کہ اس امر کو میں نے کس طرح  
پیش کیا ہے میں یہاں حرکت قلب اور شرائین کی تشریح بیان  
کرنا چاہتا ہوں۔ قلب کی حرکت حیوانات میں عام ترین اور اولین  
حرکت ہے۔ چنانچہ اس سے باقی کی نسبت بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ  
کیا رائے قائم کرنی چاہئے۔ اب آگے چل کر جو میں کہنا چاہتا ہوں  
اسے سمجھنے میں آسانی یوں ہوگی کہ جو لوگ علم تشریح سے ناواقف  
ہیں اپنے سامنے کسی پچھڑے والے بڑے جانور کا دل کاٹ کر  
رکھ لیں۔ ایسے جانور کا دل انسان کے دل سے کھائی مشابہ ہوگا۔  
پھر دل کے دونوں خانوں پر نظر کریں جو خول کے طور پر ہیں۔ ان کے

بعد اول یہ ملاحظہ کریں کہ واسطے خانے سے دونوں لیاں متعلق ہیں یعنی  
 "خول رگ" جو خون کا اصلی ظرف ہے اور گویا ایک شجر کا تنہ ہے  
 کہ جسم بھر کی ساری رگیں اسی کی شاخیں ہیں۔ اور "ورید شریانی" جسکا  
 یہ نام غلطی سے رکھ دیا گیا ہے کیونکہ درحقیقت یہ محض ایک شریان  
 ہے کہ قلب سے نکلتی جہاں باہر آتی ہے وہیں سے اس کی بہت  
 سی شاخیں ہو گئی ہیں اور اسی جگہ سے پیچیدہ طوروں میں پھیل گئی ہیں۔ دوم  
 لیاں خانہ دیکھئے اس سے بھی پہلی ہی کی طرح دونوں لیاں متعلق  
 ہیں جو صدف الذکر کے برابر یا بڑی ہیں یعنی "شریان وریدی" جسکا  
 یہ نام بھی اسی طرح غلط ہے۔ کیونکہ یہ محض ایک ورید ہے جو  
 پیچیدہ طوروں سے جہاں وہ بہت سی شاخوں میں منقسم تھی آتی ہے  
 اور اس کی یہ شاخیں ورید شریانی کی شاخوں اور ہوا کی نالی سے  
 (یعنی جس سے سانس اندر جاتی ہے) اکٹھی ہوئی ہوئی ہے۔  
 نیز "شریان کبیر" ہے جو قلب سے نکلتی ہے شاخیں سارے  
 جسم میں پھیلائے ہوئے ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ ایسے اصحاب کو  
 کوئی کوہ گیارہ جالیاں بھی صاف صاف دکھا دیتا جو گویا ننھے ننھے  
 سورخوں کی طرح ان دونوں خانوں کی چاریوں کھڑکیوں کو کھولتے  
 بند کرتے رہتے ہیں۔ ان گیارہ میں سے تین تو خول رگ کے دہانہ  
 پر ہیں جہاں وہ کچھ اعلیٰ طور پر واقع ہیں کہ جو خون اس خانہ میں بھرا  
 رہتا ہے اسے قلب کے واسطے خانہ کے اندر داخل ہونے سے  
 کسی طرح نہیں روکتے مگر اس کو باہر کی جانب بہ جانے سے  
 کافی طور پر روکتے ہیں۔ اور تین ورید شریانی کے دہانہ پر ہیں جنکے

Vena Cava ۵۱

Vena Arteriosa ۵۲

Arteria Venosa ۵۳



فعل کی ترتیب اول الذکر کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی اس خانہ میں جو خون بھرا رہتا ہے اسے پھیپھڑوں میں تو جانے دیتے ہیں لیکن جو خون پھیپھڑوں میں ہے اسے اس خانہ کی طرف پلٹنے سے روکتے ہیں۔ اسی طرح دو اور شریان وریدی کے دہانہ پر ہیں جو خون کو پھیپھڑوں سے قلب کے داہنے خانہ میں تو آنے دیتے ہیں مگر اس کی واپسی میں مزاحم ہوتے ہیں اور تین شریان کبیر کے دہانہ پر ہیں جو خون کو قلب سے باہر جانے دیتے ہیں مگر پلٹنے سے روکتے ہیں۔ جالیوں کی اس تعداد کے بارے میں کوئی وجہ بجز اس کے نہیں بتائی جاسکتی کہ شریان وریدی کی شکل اس کے عمل وقوع کی مناسبت سے بیضاوی ہے اور اسے بند کر نیلے لئے دو کھڑکیاں کافی ہیں باقی کی شکل گول ہے اور اس وجہ سے ان کے بند ہونے کے لئے تین تین کھڑکیوں کی ضرورت ہے۔ یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ شریان کبیر اور ورید شریانی بہ نسبت شریان وریدی اور خول رگ کے سخت تر اور زیادہ مضبوط ساخت کی ہیں اور ہر دو موخر الذکر جس جگہ پر قلب میں داخل ہوتی ہیں تھیلیوں کی طرح ابھری ہوئی ہیں۔ ان تھیلیوں کو "آونین" (یعنی قلب کے دونوں کان) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کی ترکیب اسی مادہ سے ہوئی ہے جس سے خود قلب بنا ہے۔ واضح ہو کہ قلب میں جسم کے ہر حصہ سے زیادہ حرارت ہوتی ہے۔ اس حرارت کی صفت یہ ہے کہ دل کے خانوں میں خون کا جو قطرہ داخل ہوتا ہے اسے یہ اس طرح جلدانہ جلد پھیلائی اور پھیلائی جلی جاتی ہے جیسے کوئی رقیق چیز کسی گرم برتن میں قطرہ قطرہ گر کر پھیلے اور پھلے۔ اس کے بعد حرکت قلب کی توجیہ میں اس سے زیادہ کہنے کی حاجت نہیں کہ جب قلب کے خانے خون سے پر نہیں ہوتے تو ان میں خون خود سے بھر نے لگتا ہے یعنی خول رگ سے داہنے خانہ میں اور شریان وریدی سے بائیں خانہ میں

کیونکہ یہ دونوں طرف خون سے خوب بھرے رہتے ہیں۔ اُن کی  
 کھڑکیاں جو دل کی طرف کھلتی ہیں پھر بند نہیں ہوتیں۔ جوں ہی کہ اس  
 طرح ایک ایک قطرہ خون ہر خانہ میں داخل ہوا (ظاہر ہے کہ ہر قطرہ  
 بہت بڑا ہوتا ہے کیونکہ جس راہ سے وہ آتا ہے وہ راہ کشادہ ہے  
 اور اُس کا طرف لبریز ہے) فوراً رقیق ہو جاتا ہے اور گرمی پا کر پھیل  
 جاتا ہے پس اس سے سارے قلب میں تمد و پیدا ہوتا ہے اور معاً  
 وہ پانچوں ننھے ننھے سوراخ جو اُن قطروں کو جاری کرنے واسطے  
 طرف کے وہانوں پر ہیں دب کر بند ہو جاتے ہیں اور مزید خون  
 قلب میں اترنے سے روک دیتے ہیں پھر یہ قطرے جواب اور بھی  
 رقیق ہو گئے ہیں اُن چھ سوراخوں کو جو دوسرے دونوں طرف  
 کی کھڑکیوں میں ہیں دھکا دیکر کھول لیتے ہیں اور اسی راہ سے  
 باہر کی طرف نکل جاتے ہیں۔

اس طور پر قلب کے پھولنے کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ شریان  
 کبیر اور ورید شریانی کی تمام شاخیں پھول اٹھتی ہیں اور پھر فوراً  
 شریان کے ساتھ ساتھ سکڑنا بھی شروع ہو جاتی ہیں کیونکہ  
 جو خون اس میں آگیا ہے وہ اب سرد ہو گیا ہے اور وہ چھ ننھے  
 ننھے سوراخ بند ہو چکے ہیں۔ گویا اب خول رگ اور شریان وریدی  
 کے پانچوں سوراخوں کے کھلنے کی باری ہے جو پھر دو قطرے خون  
 کے اندر داخل کریں گے اور قلب اور شریان میں پھر سے تمد پیدا  
 ہوگا۔ چونکہ قلب میں جانے والا خون دو تھیلیوں (افین قلب)  
 سے ہو کر گذرتا ہے اس لئے ان تھیلیوں کا مد و جزر قلب کے  
 مد و جزر کے خلاف ہوا کرتا ہے۔ جب قلب پھیلتا ہے تو سیکری  
 ہیں۔ جو لوگ ریاضیاتی استدلال کی اہمیت سے نا بلد ہیں اور یہی  
 براہین کو احتمالات سے تمیز نہیں کر سکتے وہ شاید بغیر جانچے ہوئے  
 میرے اس دعوے سے انکار کریں جو میں نے اس بیان میں کیا ہے

لہذا میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے جس حرکت کی یہ توجیہ کی ہے وہ آنکھوں سے نظر آنے والی ترتیب اعضا اور ہاتھ سے محسوس ہونے والی حرارت اور تجربہ سے دریافت کی ہوئی خون کی سرشت سے اُسی طرح لازم آتی ہے جیسے گھڑی کی حرکت اُس کے پرزوں کی ساخت وغیرہ سے۔

اگر پوچھا جائے کہ وریدوں کا خون جو مسلسل قلب میں جاتا رہتا ہے ختم کیوں نہیں ہو جاتا اور شرائین لبریز کیوں رہتی ہیں جہاں کیونکہ جتنا خون قلب سے ہو کر گزرتا ہے ان ہی میں جاتا ہے تو اس کا جواب انگلستان کے ایک ماہر طبیعیات کے قول سے نکلتا ہے جس نے سب سے پہلے اس موضوع پر علم اٹھایا تھا اُس نے یہ واضح کیا ہے کہ شرائین کے سروں پر بہت سی چھوٹی چھوٹی رگیں کھلی ہوئی ہیں اور جو خون شرائین کو قلب سے حاصل ہوتا ہے انہیں سے گزر کر چھوٹی چھوٹی رگوں میں جاتا ہے اور پھر قلب میں واپس آ جاتا ہے حتیٰ کہ خون کی رگزدور دور این سلسل کی مرادف ہے۔ اس کا ثبوت جراحوں کے معمولی تجربوں سے ظاہر ہے کہ وہ جس جگہ پر قصد کھولتے ہیں اُس جگہ کے اوپر بازو کی کسی قدر تنگ بندش کر کے خون کو اُس سے زیادہ روانی کے ساتھ جاری کر لیتے ہیں کہ جتنا بغیر بازو پر بندش کے ہوتا۔ حالانکہ اگر یہ بندش قصد کے وقت مقام قصد اور کلائی کے بیچ میں ہو یا اگر مقام قصد کے اوپر ہو مگر زیادہ جیت کر دی جائے تو صورت بالکل برعکس ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جب بندش زیادہ تنگ ہوگی تو خون کو قلب کی طرف پلٹنے سے روکے گی لیکن تازہ خون کو جو شرائین میں بڑھ رہا ہے آ رہا ہے نہ روکے گی کیونکہ شرائین وریدوں کے نیچے واقع ہوئی ہیں اور زیادہ سخت ہونے کی وجہ سے ان کا غلاف

بندش سے مشکل دیتا ہے اور شریان میں جو خون قلب سے  
 باقی رہتا ہے اس کے مقابلہ میں خون کے جو وریڈوں کے ذریعہ  
 قلب کو جارہا ہے زیادہ زور سے دھکا ہے۔ اب جبکہ وریڈوں  
 میں سے کسی ایک کے کاٹ دینے سے بازو کا سارا خون خارج  
 ہو سکتا ہے تو ظاہر ہے کہ بندش سے پیچھے ہٹ کر یعنی بازو  
 کے ہر سارے پر ایسی راہیں ہونی لازمی ہیں جن سے گذر کر یہ خون  
 شریان سے قصبہ کی جگہ پہنچے۔ اس ماہر طبیعیات نے  
 دوران خون کی بحث میں اپنا دعوہ کیا ہے دکھا کر خوب ثابت  
 کیا ہے کہ وریڈوں کی راہوں میں بھی مختلف مقامات پر پتے  
 نئے سوراخ کی صورت کی چند جالیوں موجود ہیں جن کی وضع  
 ایسی ہے کہ خون کو وسط جسم سے جسم کے سروں کی طرف نہیں  
 جانے دیتے بلکہ سروں کے طرف قلب کی طرف جانے  
 دیتی ہیں۔ اس ضمن میں اس نے تجربہ سے بھی استدلال  
 کیا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ ہر وقت ایک شریان کے کٹ  
 جانے سے سارے جسم کا خون خارج ہو سکتا ہے حتیٰ کہ اگر وہی شریان  
 فواح قلب میں بھی نہایت مضبوطی کے ساتھ باندھ دی ہو  
 اور اس بندش اور قلب سے درمیان سے قصبہ کی گئی ہو  
 (یعنی ہر طرح اطمینان کر لیا گیا ہو کہ اب جو خون آئے گا براہ راست  
 قلب سے آئے گا) تب بھی سارے جسم کا خون اسی ایک جگہ سے  
 خارج ہو سکتا ہے۔

دوران خون کی جو توجیہ میں نے کی ہے اور بھی بہت سے  
 امور سے اسی طرح پر ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک توجیہ کہ  
 وریڈوں اور شریانوں سے جاری ہونے والے خون میں جو فرق  
 ہے اس کی علامت یہ ہے کہ قلب سے گذر چکنے پر خون فوراً  
 رقیق اور تازہ بلکہ گرم ہوتا ہے کیونکہ ابھی وہ قلب میں گھل چکا ہے

اور قطرہ قطرہ ہونے کے بعد شرائین میں پہنچا ہے۔ حالانکہ قلب میں داخل ہونے سے پیشتر یعنی جیتک کہ وریدوں ہی میں رہتا ہے اس میں یہ باتیں نہیں ہوتیں۔ غور کرنے سے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گا کہ وریدوں اور شریانوں کے خون کا یہ فرق جس قدر نواح قلب میں نمایاں ہوتا ہے جسم کے دوسرے حصوں میں اتنا نمایاں نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ ورید شریانی اور شریان کبیر کے غلافوں کی مضبوطی پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں مقابلہ وریدوں کے خون زیادہ جولاہی کے ساتھ ابھرتا ہے۔ اگر شریان وریدی کا خون جو قلب سے گزر کر پھیپھڑوں میں اچکا ہے خول رگ سے نکلے ہوئے خون کے مقابلہ میں رفیق اور تیزی اور زیادتی کے ساتھ پھٹنے والا نہ ہوتا تو قلب کا یاہاں خانہ اور شریان کبیر بہ نسبت داہنے خانہ اور ورید شریانی کے زیادہ کشادہ اور بڑی کیوں ہوتی۔ جیتک اطباء کو نہ معلوم ہو کہ جوں جوں خون اپنی کیفیت بدلتا ہے اور قلب کی گرمی سے کمی بیشی کے ساتھ بلکہ کم و بیش سرعت کے ساتھ پھیلتا ہے تو وہ نبض سے کب کوئی اندازہ کر سکتے ہیں۔ اگر یہ تحقیق کرنا ہو کہ حرارت دوسرے اعضا تک کیونکر متعدی ہوتی ہے تو کیا یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ اس کا ذریعہ خون ہی ہے جو قلب سے جاری ہوتا ہے اور وہیں گرم ہو کر تمام جسم میں پہنچتا ہے حتیٰ کہ جب کسی حصہ جسم سے خون برآمد کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ حرارت بھی خارج ہوتی ہے اور اگر قلب سے تازہ خون مسلسل نہ چلتا رہے تو قلب میں خواہ دہکتے ہوئے لوہے کی سی گرمی کیوں ہو ہمارے ہاتھ پاؤں اس طرح گرم نہیں رہ سکتے۔ اسی صورت سے پتہ چلتا ہے کہ تنفس سے اصل منشاء پھیپھڑوں میں تازہ ہوا پہنچانا ہے تاکہ پھیپھڑوں میں جو خون قلب کے داہنے خانہ سے پھل کر آتا ہے اور گویا بھاپ کی شکل میں ہوتا ہے اس کے کوہ پھل



بائیں خانہ میں جائے سرد ہو کر کثیف ہو جائے اور پھر خون کی شکل  
 پر آجائے۔ بغیر اس کے جو آگ و ہاں موجود ہے اس کی بردباری  
 میں تنفس کوئی مدد نہیں دے سکتا۔ اس کی تصدیق یوں بھی ہو سکتی  
 ہے کہ جن جانوروں کے پیچھے انہیں ہوتا اُن کا قلب صرف ایک  
 خانہ ہوتا ہے اور کچھ جسم میں ہوتا ہے اور پیچھے پٹروں سے  
 کام نہیں لے سکتا تو اس جگہ پر ایک سو راخ ہوتا ہے جس سے  
 خون خول رگ سے قلب کے بائیں خانہ میں گزرتا رہتا ہے اور ایک  
 نالی بھی ہوتی ہے جس کے اندر سے خون بغیر پیچھے پٹروں سے  
 گذرے ہوئے وریڈ شریانی اور شریانی کبیر میں چلا جاتا ہے۔  
 دوسرے یہ کہ جب تک معدہ میں شریان کے ذریعہ سے قلب  
 کی گرمی نہ پہنچے اور خون کے بعض سیال ترین اجزاء جو تحلیل غذا  
 میں مدد دیتے ہیں داخل نہ ہوئے رہیں ہاضمہ کا فعل کیونکر جاری  
 رہ سکتا ہے؟ جس عمل سے جو ہر غذا خون کی صورت اختیار  
 کرتا ہے وہ بھی یہ ملاحظہ کرنے سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ خون قلب  
 سے ذن میں سویا دو سو مرتبہ گزرتا ہے اور وہاں قطرہ قطرہ ہوا کرتا  
 ہے۔ تغذیہ اور جسم کے مختلف خلطوں کی پیدائش کے بارہ میں  
 اس سے زیادہ کہنے کی کیا حاجت ہے کہ خون جب پھلتے ہوئے  
 زور و شدت کے ساتھ قلب سے شریان کے سروں کی جانب  
 دوڑتا ہے تو اعضا میں جہاں جہاں پہنچتا ہے اپنے اجزاء چھوڑتا جاتا  
 ہے اور یہ نئے اجزاء پُرانے اجزاء کو ہٹا کر اُنکی جگہ خود لے لیتے ہیں  
 اور جن مسامات سے اُن کو سابقہ پڑتا ہے اُن کی جگہ وضع اور خلا  
 کے اعتبار سے بعض اجزاء نکل کر اپنی مناسب جگہیں پا جاتے ہیں  
 اور باقی اپنے لئے جگہ ڈھونڈا کرتے ہیں۔ یہ بالکل وہی صورت  
 ہے جیسے کسی جھلنی میں چھوٹے بڑے سو راخ کر کے غلہ کی مختلف  
 جنہیں الگ الگ کر لی جاتی ہیں۔ بالآخر اس ضمن میں روح حیوانی

کی پیدائش قابل ذکر ہے جو نہایت لطیف ہوا بلکہ ایک نہایت خاص  
 اور بھڑکتے ہوئے شعلہ کی طرح مسلسل اور بہت کثرت کے ساتھ  
 قلب سے دماغ پر چڑھتی رہتی ہے اور وہاں سے اعصاب  
 میں ہو کر عضلات میں پہنچتی ہے جس سے تمام اعضا میں حرکت  
 پیدا ہوتی ہے۔ خون کے وہ اجزاء جن میں ہیکان اور سرایت  
 کرتے کی استعداد زیادہ ہوتی ہے اس روح کی ترکیب میں کام  
 آنے کی صلاحیت زیادہ رکھتے ہیں اور دماغ کی طرف دوڑتے  
 ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جو شرائین انکو اوپر کو چڑھاتی ہیں وہ قلب سے  
 بہت سیدھی راہ سے آتی ہیں اور میکائی اصول کے ماتحت  
 (جو عین قواعد فطرت ہیں) وہی صورت میں آتی ہے جو مختلف  
 جڑوں کے ایک مرکز کی طرف مائل ہوئے ہیں کہ جو چیز زیادہ  
 زوردار اور ہیکان انگیز ہوتی ہے وہ اپنے کمزور اور سست ہیکان  
 کو ڈھکیل کر الگ کر دیتی ہے اور خود مرکز تک پہنچ جاتی ہے۔  
 جس رسالہ کو میں پہلے شائع کرنا چاہتا تھا اس میں ان امور پر بہت  
 کافی بحث کی گئی تھی اور دکھایا گیا تھا کہ یہ جسم انسان  
 اعصاب و عضلات کس ساخت کے ہونے چاہیے کہ روح کو  
 جو ان میں سے اعضا میں حرکت پیدا کرنے کے قابل ہو سکے  
 کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ سر کے کٹ جانے سے جانور اگرچہ مر جاتا  
 ہے مگر کچھ دیر تک سر میں حرکت ہوا کرتی ہے اور وہ زمین پر  
 تڑپا کرتا ہے۔ نیز کہ دماغ میں کس قسم کے تغیرات پیدا ہوتے  
 ضرور کی ہیں جن سے سو نا جاکنا اور خواہش و کھینچا پھیر ہوتا ہے  
 روشنی۔ آواز۔ اور ذائقہ گرمی وغیرہ کی اشیا کے جملہ صفات  
 جو اس کے واسطے دماغ کو گھبراہٹ دیتے ہیں کہ مختلف  
 خیالات پیدا ہوں اور ہر ایک پاس اور دور سے آواز و  
 تاثرات دماغ کو گھبراہٹ دیتے ہیں کہ خاص قسم کے خیالات

پیدا ہونا شروع ہو جائیں۔ جس مشترک کیا ہے جس سے تصور  
 ذہن میں جاگزیں ہوتے ہیں، حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں، اور  
 ان میں تغیرات پیدا کر کے جدید تصورات پیدا کر لیتا ہے۔ یہی  
 جس ہے جو ان ذرات سے روح جنماتی کو حرکت میں لاتی ہے  
 اور پھر اس کو جسم کے رک پتھوں میں تقسیم کر کے اعضا کی ان  
 سبب بنتی ہے جو حرکات ارادی سے بالکل مختلف ہوتی ہیں اور اندرونی  
 اور بیرونی محسوسات سے مخصوص مناسب رکھتی ہیں۔ ان لوگوں کے  
 لئے یہ امور خفا ہیں عجیب ہیں جنہوں نے حیوانات کے نظام جسمانی  
 کا مقابلہ مشینوں اور کلوں سے کیا ہو اور دیکھا ہو کہ ان سے کس کس  
 قسم کی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ ہمارے ہی کلوں کے معدودے  
 چند پوزے ان سیکڑوں پڑیوں، عضلات، انقباض، شراہین اور  
 اور وہ وغیرہ کے مقابلہ میں بالکل سچ ہیں جو معمولی حیوانات کے جسموں  
 میں موجود ہیں۔ ہمارا جسم گویا دست قدرت کی بنائی ہوئی ایک کل  
 ہے جو ہمارے کلوں سے کہیں زیادہ قابل تعریف ہے کیونکہ اس  
 کی ترکیب و ترتیب بے نظیر ہے اور اس کے حرکات و سکنات  
 سوز و نیست میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ یہاں تک بیان کر چکے ہیں  
 بعد میں نے یہ دکھانا شروع کیا کہ کوئی ایسی کل بن سکے جو ظاہری  
 اور باطنی اسباب کے لحاظ سے ہمارے جسم کے ہونہ کی ہو تو سچی  
 دو ایسی علامتیں ضرور ہونی چاہئیں۔ پہلی یہ کہ اس میں  
 اول تو یہ کہ ان کے حرکات میں ایسی ترتیب نہ پائی جائے گی جیسی  
 ہمارے الفاظ و اشارات میں ہوتی ہے جس کی بدولت ہمارے  
 خیالات و دوسروں پر ظاہر ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ پہلے  
 کل الفاظ و اشارات کے پر فائدہ کر دیکھا جائے یا اس کے  
 حرکات کے مرادفات بالترتیب ادا ہو جائیں۔ مثلاً اس کے  
 چھوٹے سے ایک آواز پیدا ہو جس سے کوئی سوال فکلتا ہو یا دہلے

وہ چیخ اُٹھے وغیرہ۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کل کے ذریعہ سے جو الفاظ ادا ہوں اُن میں ویسی ترتیب پائی جائے جیسی ادنیٰ عقل کے آدمی کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کل مد مقابل شکر بات چیت کر سکے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اگرچہ کلوں کے ذریعہ سے بیشک وہ کام ہو سکتا ہے جو اتنی کثرت و خوبی کے ساتھ ہم نہیں کر سکتے۔ لیکن اُن کاموں کو چھوڑ کر جن کے لئے یہ کل بنی ہے دوسرے کاموں میں ہمیشہ آسانی پتہ چل جائے گا کہ ان کا فصل واقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ محض پرزوں کی ساخت کے بل پر تھا۔ وہ ہمہ گیر آلہ عقل ہی ہے جس سے ہر موقع پر اُس موقع کے لحاظ سے کام لیا جاسکتا ہے۔ جو چیز محض پرزوں کے بل پر ہو وہ مخصوص امور کے لئے مخصوص ترتیب چاہتی ہے۔ پس ایسی کل ایجاد ہونا جو ہر موقع پر عقل کی طرح کام کر سکے محالِ عملی ہے۔ نیز یہی دو علامات ہیں جن سے آدمی اور جانور میں تمیز ہو سکتی ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی خواہ وہ مخنون ہی کیوں نہ ہو اس قدر غبی اور احمق نہیں ہو سکتا کہ الفاظ کو یکجا کر کے اپنا مطلب تک ادا نہ کر سکے حالانکہ جانور خواہ وہ کتنا ہی ترقی یافتہ اور مناسب حالات میں پرورش پالیا ہو کیوں نہ ہو اتنی صلاحیت نہیں پیدا کر سکتا۔ طوطا اور مینا ضرور ہماری طرح الفاظ ادا کر لیتے ہیں لیکن ہماری طرح گفتگو نہیں کر سکتے یعنی یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ وہ جو کہتے ہیں اُسے ہماری طرح سمجھتے بھی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ماورِ زاد گونگے اور بہرے آدمیوں کو دیکھئے جو قوت گوئی میں ان پرندوں سے بھی کم ہیں لیکن صحبت کے اثر سے ان خود اس لائق ہو جاتے ہیں کہ اشاروں سے اپنے خیال کی ترجمانی کر لیں۔ اس سے صرف یہی نہیں ثابت ہوا کہ جانوروں میں عقل کم ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اُن میں عقل باطل نہیں ہے۔ کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان کو گفتگو کرنے کے لئے بہت خٹوری عقل درکار ہوتی ہے



نیز یہ کہ بغیر عقل کے گفتگو محال ہے۔ چونکہ ایک نوع کے جانوروں  
 میں بھی نوع انسان کی طرح ایسے افراد ضرور ہوتے ہیں جن کے  
 قابلیت کی کمی بیشی ظاہر ہوتی ہے اور بعض افراد میں سمجھنے کی قوت  
 خصوصیت کے ساتھ دوسرے افراد کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے  
 اس لئے یہ خیال صحیح نہ ہوگا کہ مثلاً طوطے یا بندر کی جنس کا کامل ترین  
 فرد بھی اس صلاحیت کے لحاظ سے اپنی جنس کے احمق ترین بچے  
 یا مجنون احم جنس سے بھی بہتر نہ ہوگا۔ البتہ یہ بات اور ہے کہ  
 جانوروں کی روح کو انسان کی روح سے بالکل ہی مختلف مان کر  
 اس رائے کو صحیح سمجھ لیا جائے ایک لحاظ یہ بھی کرنا چاہیے کہ گفتگو  
 اُن فطری حرکات سے ایک الگ چیز ہے جن سے بہیمیت کا  
 اظہار ہوتا ہے یا جن کی نقل کلوں کے ذریعہ سے بھی کی جاتی ہے  
 قدما کے اس خیال سے متاثر نہ ہونا چاہیے کہ اگرچہ جانوروں کی گفتگو  
 ہماری سمجھ میں نہیں آتی تاہم وہ گفتگو سے فاصلہ نہیں ہیں۔ جانوروں کو  
 ہمارے ایسے بہت سے اعضا قدرت نے دیئے ہیں اور اگر وہ  
 آپس میں کچھ تبادلۂ خیالات کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس  
 مدد تک ہم اُن کے خیالات سے واقف نہ ہو سکیں۔ یہ سچ ہے کہ  
 بعض کاموں میں بہت سے جانور ہم سے بہتر صناعتی دکھاتے ہیں  
 مگر اُن کاموں سے انکا صاحب ذہن ہونا نہیں ثابت ہوتا کیونکہ وہی جانور  
 ہمارے اکثر کاموں کے لئے بالکل بیکار ہیں۔ بہر کیف یہ نتیجہ تو  
 کسی طرح نہیں نکل سکتا کہ وہ ہماری جنس کے ہر فرد سے زیادہ  
 عقل رکھتے ہیں یعنی ہر امر میں ہم سے حقیقت کے جاسکتے ہیں  
 بخلاف اس کے ثابت یہ ہوتا ہے کہ وہ عقل سے محروم ہیں اور  
 محض اُن کے اعضا کی ساخت کے لحاظ سے اُن میں فطرت  
 کام کر رہی ہے اور اُن کی مثال بالکل گھڑی کی سی ہے جو صرف  
 چند چکروں اور اوزان وغیرہ سے بنی ہے اور باوجود ہماری استعداد



ہوشمند کی کہ ہم سے زیادہ صحت کے ساتھ گھنٹوں کا شمار اور تفت کی پیمائش کر سکتی ہے۔

اس کے بعد میں نے روح عقلی کا بیان شروع کیا اور دکھایا کہ دوسری اشیاء کی طرح یہ مادہ کی قوت سے نہیں حاصل ہو سکتی بلکہ خاص طور پر خلقت ہوئی ہے۔ اس کی حیثیت جسم میں صرف اتنی ہی نہیں ہوئی جو ایک تا خدا کی جہاز میں ہوا کرتی ہے کیونکہ مادہ اس کے کہ اعضا میں حرکت ہی پیدا کرتی ہے اس کا تعلق جسم سے اس قدر گہرا ہے کہ بغیر اس کے نہ تو انسان میں ہمارے ایسے حواس و شہوات کا وجود ہو سکتا ہے نہ انسان کی ترکیب مکمل ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد میں نے روح کے موضوع پر ایک طویل بحث کی کیونکہ یہی چیز سب سے زیادہ اہم تھی۔ دنیا میں نیکی کی راہ سے گمراہ کرنے والا عقیدہ سب سے بڑھکر تو وہ ہے جو وجود باری سے انکار کرنے والوں کی ترویج کے ضمن میں اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس عقیدہ کا رد یہ ہے کہ انسان اور بہائم کی روح میں بلحاظ سرشت کوئی فرق نہیں اور مردے کے بعد تکلیف اور حیوانیتوں کا جو حال ہو گا وہی ہمارا بھی ہو گا اور اس لئے کسی قسم کی امید و بیم اس بارہ میں ہونا چاہئے۔ الر فی الواقع انسان اور بہائم کی روح کا فرق معلوم ہو جائے تو بہن وجود کی بنا پر روح اور جسم کا مختلف ایجنس ہونا تسلیم کیا گیا ہے وہ وجود اور بھی ذہن نہیں ہو جائے اور بخوبی واضح ہو جائے کہ روح ہرگز جسم کی طرح قاتی نہیں اور بالآخر جو تک روح کو فنا کرنے والے کوئی اسباب نظر نہیں آئے اس لئے ہم قدرتی طور پر اس نتیجہ کی طرف مائل ہیں کہ روح قاتی نہیں

## حکم

مذکورہ بالا مسائل جس رسالہ میں درج ہیں اس کو ختم کئے ہوئے  
 ہیں سال ہو گئے جب میں اس پر نظر ثانی کر رہا تھا کہ اسے چھیننے  
 کے لئے مجھ کو اسکی اثناء میں بعض ایسے اصحاب نے جن کی  
 وقت میرے دل میں بہت سی اور جن کا اثر میرے اعمال پر  
 اس سے کچھ کم نہ تھا جتنا میری عقل کا میرے خیالات پر ہے  
 ایک دوسرے کے مخالف کے شائق ہوئے کسی نظریہ طبیعیات  
 کو مردود قرار دیا۔ میں یہ تو نہ کہوں گا کہ مجھے اس مصنفیت سے اتفاق  
 تھا البتہ یہ کہ اس نظریہ کے حامیوں نے اس سے قبل میں نے اس  
 نظریہ میں ایسی کوئی بات نہیں پائی تھی جسے میں مذہب یا حکومت  
 کے حق میں مضرت خیال کر سکتا اور جس سے نہ تھی تو اس کی بھی کوئی  
 وجہ نہیں کہ اگر میری عقل اس نظریہ کو قبول کر لیتی تو بھی اس کو  
 میں اپنی تحریر میں لاسنے سے گریز کرتا۔ البتہ مجھے اس سے یہ خیال  
 ضرور پیدا ہوا کہ اس رسالہ میں جسے جو کچھ درج کیا ہے اس میں  
 باوجود میری شدید افسوس اور موافق دلائل سے مبادا کوئی ایسی بات  
 نہ شامل ہو گئی ہو جو حقیقت سے پیدا ہو یا جس سے کسی کو صدمہ  
 مصنف کا اندیشہ پیدا ہو سکے۔ میں اپنی مصیبت تھا جس نے مجھ سے اسکی  
 اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں نے یہ ارادہ نہایت قوی وجوہ کی  
 بنا پر کیا تھا۔ لیکن اس موقع پر لکھا کہ اس نے مجھے جو نفرت

وہ غالب آگئی اور بعض دوسرے امور کا بھی لحاظ کرتا پڑا، غرض کہ میں معذور ہو گیا۔ اب اُن وجوہ کا ذکر اگر ایک طرح سے میرے لئے مفید مطلب ہے تو دوسری طرف عامۃ الناس کے لئے بھی فائدہ سے خالی نہیں۔

اپنے ذہن کی پیداوار کو میں نے کبھی اہمیت نہیں دی اور جو دشواریاں قیاسی علوم میں پیش آتی رہتی ہیں اُن کی طرف سے جب تک میں نے خود کو مطمئن نہیں کر لیا اور خود ساختہ طریقوں سے حاصل کئے ہوئے اصول کے مطابق اپنے اعمال کو منضبط کرنے کی کوشش کے ماسوا، جب تک کوئی اور فائدہ بھی میں نے اپنے طریقہ کے بموجب نہیں اٹھالیا، اُس وقت تک میں نے کسی امر کی اشاعت اپنے لئے لازمی نہیں سمجھی۔ یہاں تک اعمال کا تعلق ہے میرا یہ قول ہے کہ ہر شخص اپنے جو ہر عقل سے اس قدر قرین ہے کہ علاوہ اُن لوگوں کے جنہیں خدا نے کسی قوم کا سردار بنایا ہے یا جنہیں کافی عظمت اور ہمت دیکر پیغمبری کا درجہ عنایت کیا ہے دنیا میں جتنے نفوس ہیں اُن سے ہی مضلین بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر بشرطیکہ وہ اصلاح اعمال کا موقع حاصل کر لیں۔ میں اپنے دل میں بہت خوش ہوا کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ دوسرے لوگ اپنی اپنی رائے لکھتے ہیں اور مجھ سے زیادہ اپنی جگہ خوش ہیں مگر جب مجھے طبیعیات کے بعض عمومی تصورات حاصل ہوئے اور میں نے خاص خاص دشواریوں میں اُن کا امتحان کر کے دیکھ لیا کہ یہ تصورات کس درجہ مفید ہیں اور پھر انہی اصول سے کہاں تک مختلف ہیں جو اب تک رائج چلے آتے تھے، تب میرا عقیدہ ہو گیا کہ چونکہ مفاد عامہ کو فروغ دینا ہمارا فرض ہے اس لئے ان تصورات کا اب چھپانا ایک گناہ عظیم سے کم نہیں۔ کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ ان تصورات کی مدد سے بجائے قیاسی فلسفہ کے جو مدار میں پڑھایا جاتا ہے ایک عملی فلسفہ کا دریافت ہو جانا بھی

ممکن ہے، اور وہ معلومات حاصل ہو سکتے ہیں جو زندگی میں نہایت  
 کار آمد ہونگے۔ ان ہی تصورات سے آگے۔ پانی۔ ہوا۔ ستارے۔  
 آسمان اور جملہ اجسام جن سے ہماری زندگی محصور ہے سب کی  
 قوت و فعلیت کا علم اسی قدر صراحت کے ساتھ حاصل ہو سکتا  
 ہے جیسے ہم اپنے صنایعوں کی مختلف صنایعیاں پہچانتے اور  
 جانتے ہیں۔ اور ان معلومات کو ہم اپنے تمام کاموں میں ہمارے  
 جس طرح اور جس عنوان سے ممکن ہو استعمال کرنے کی کوشش  
 بھی کر سکتے ہیں اور گویا خود کو فطرت کا مالک و مختار بنا سکتے ہیں  
 کم از کم پیش نظر ہی مقصد ہونا چاہئے۔ یہ نہ صرف اس غرض سے  
 کہ طرح طرح کے بے شمار فنون ایجاد ہو جائیں جن سے بغیر کسی  
 زحمت کے دنیا کی ساری نعمتوں اور راحتوں کا لطف اٹھانا  
 ممکن ہو جائے بلکہ اس لئے کہ حفظانِ صحت کے اسباب  
 فروغ پائیں کیونکہ صحت ہی تمامی برکاتِ حیات میں سب سے مقدم  
 اور اصولی چیز ہے۔ ذہن بھی اعضائے جسمانی کی کیفیات اور  
 تعلقات کا اس قدر تابع ہے کہ میرے نزدیک اگر کسی شخص کی  
 ذہانت اور دکاوت میں اضافہ کرنے کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے  
 تو اس کی تلاش فنِ طب میں کرنی چاہئے۔ گو یہ صحیح ہے کہ  
 علمِ طب میں ابھی تک ایسی بہت سی چیزیں نایاب ہیں جن  
 معذ بہ فائدہ اٹھایا جاسکے۔ اور بلا نیت استخفاف میں کہہ سکتا  
 ہوں کہ گروہِ اطباء میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جسے اقرار نہ ہو کہ  
 اس فن میں جو کچھ اب تک دریافت ہوا ہے وہ اس کے  
 مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جو ابھی دریافت ہونے کو باقی ہے۔  
 امکان تو یہاں تک ہے کہ ہم اپنے کو لا تعداد جسمانی اور ذہنی  
 امراض سے اور شاید ضعفِ پیری سے بھی بالکل محفوظ بنا سکتے  
 ہیں، بشرطیکہ ان چیزوں کے علل و اسباب اور فطرت کے

پیدا کئے ہوئے علاج سے کافی واقفیت حاصل کر لیں۔ پھر شروع میں سے تو ایسے ضروری علم کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینی نیت کر ہی لی تھی اور سمجھتا تھا کہ جو کوئی میری راہ کو اختیار کرے گا مندرجہ مقصود کو ضرور پہنچے گا، بشرطیکہ عمر بیهوشی نہ کرے اور فقدان اختیار است سے راہ مسدود نہ ہو۔ ان دونوں رکاوٹوں کا تصور بس ہی سمجھ میں آیا کہ جو تصور بہت مجھے دریافت ہوا۔ اسے دیانت داری کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دوں اور دنیا کے عالی دماغ لوگوں کو ترغیب دوں کہ کام کو آگے بڑھائیں۔ غرض کہ اپنے اپنے میلان طبع اور استعداد کے مطابق ضروری اختیارات دوسرے لوگ بھی عمل میں لائیں اور جو ان کو تحقیق ہو اسکو دوسروں تک پہنچائیں۔ جہاں پر اسلاف کا ہاتھ رکے رہیں۔ اسے اخلاف اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ چنانچہ بہت سے تجربوں کی پیداوار اور بہت سی عمروں کی کھائی سے ملاحظہ کر آتی دولت ہیا ہو سکتی ہے جو کسی ایک کے لئے سے نہیں ہو سکتی۔

اختیارات کے بابت میری رائے یہی ہے کہ معلومات میں جوں جوں اضافہ ہوتا جاتا ہے یہ اور بھی ناگزیر ہوتے جاتے ہیں غیر معمولی اور دور افتادہ مظاہر فطرت کا مشاہدہ کرنے سے بہتر ہے کہ صرف ان مظاہر پر نظر رکھی جائے جو از خود ہمارے حواس کے روبرو موجود ہوتے رہتے ہیں ایسے کہ ہم اگر صرف اس پر غور ہی کرتے رہیں تو ان سے ہمارا لاعلم رہنا ناممکن ہے۔ صورت یہ ہے کہ اکثر غیر معمولی چیزیں اسی وقت تک گمراہ کرتی رہتی ہیں جب تک کہ ہم معمولی چیزوں کے اسباب پر عبور حاصل نہیں کرتے۔ کیونکہ جن احوال پر ان معمولی چیزوں کا دار و مدار ہوتا ہے وہ خود ہماری غیر معمولی اور دقیق ہوتی ہیں



اور اُن کا پتہ لگنا دشوار ہو گیا ہے۔ انکی تحقیق کے لئے میں نے یہ  
تہ تیغ اختیار کی تھی کہ پہلے عالم میں جو کچھ ہے یا ہو سکتا ہے  
اُس کے اصول اور علل اولیہ کو عام طور پر دریافت کرنے کی  
کوشش کی مگر اس سلسلہ میں بحر خدا کے جسے میں عالم کا خالق  
سمجھ چکا تھا کسی چیز کو خطرہ میں نہیں لایا اور حقیقت کے جو شاہجے  
ہمارے ذہن میں فطرت نے ڈال دیے ہیں اُن کو کسی چیز سے  
مستخرج نہیں کیا۔ اس کے بعد یہ جانچ کی کہ ان علتوں سے کون  
سے معلومات اخذ کئے جا سکتے ہیں جنہیں اولین و معمولی ترین  
معلومات قرار دیا جاسکے۔ چنانچہ اپنے نزدیک میں سے اُن  
ستارے، زمین، پانی، ہوا، آگ، جمادات وغیرہ اور اسی قسم کی  
دوسری عمومیہ رکھنے والی اور سادہ اشیاء کو بھی دریافت  
کر لیا جو بہت آسانی سے علم میں آجاتی ہیں۔ اس کے بعد حجب  
جزئیات پر مائل ہوا تو نہ معلوم کتنی مختلف النوع اشیاء کا سامنا  
تھا حتیٰ کہ میری رائے یہ قائم ہوئی کہ ذہن انسانی کے لئے ناممکن  
ہے کہ دنیا میں اجسام کی جتنی صورتیں ہیں اور اقسام ہیں انہیں ان  
لا تعداد صورتوں اور اقسام سے چیز کر سکے جن کو مشیت ایزدی  
وجود میں لا سکتی ہے۔ البتہ صرف یہی تدبیر باقی رہتی ہے کہ  
حصول معلومات کے بعد مطلق ایک چیز اور ہزاروں اعتبارات  
میں وقت صرف کریں پھر ان تمام اشیاء کو جن سے میرے  
حواس کو کبھی سابقہ پڑا تھا میں نے اپنے ذہن میں الٹ پلٹ کر  
دیکھا اور میرا دعوئے ہے کہ اُن میں ایک شے بھی ایسی نہیں  
جس کی قابل اطمینان توجیہ میں اپنے اصول کے بموجب کر سکوں حالانکہ  
مجھے اقرار ہے کہ قواعد فطرت اس درجہ ظاہر اور سیدھے ہیں اور  
میرے اصول اس قدر سادہ اور عام ہیں کہ شاید ہی کوئی معلول  
ایسا ملا ہو جسے میں نہ سمجھا ہوں کہ اس کا اشتراط ان اصول

متعدد صورتوں سے ہو سکتا ہے۔ اب جو دشواری کی بات تھی تو یہی کہ ان صورتوں میں سے کسی صورت پر کسی معلول کو اپنے اصول پر مبنی شمار کروں۔ اس سے پیچھا چھڑانے کی پس ایک تدبیر ہو سکتی تھی وہ یہ کہ ایسے اختیارات تلاش کئے جائیں جن سے پتہ چل سکے کہ معلول کی توجیہ جس صورت سے ہونی چاہئے اگر اُس کے علاوہ کسی صورت سے کیجائے گی تو نتیجہ میں فرق پڑ جائے گا۔ اب صرف یہی بات بانی رہتی ہے کہ ان اختیارات کا انتخاب کیونکر کیا جائے جن سے اس مقصد میں فی الجملہ ناکامی نہ ہو اور اپنے نزدیک میں کافی وضاحت کے ساتھ اس کا جواب دے سکتا ہوں اگرچہ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ ایسے اختیارات اس قدر کثیر اور مختلف النوع ہوں گے کہ انہیں عمل میں لانے کے لئے نہ میری سعی کفایت کر سکتی ہے اور نہ میری آمدنی۔ پس ان اختیارات کے لئے جیسے کم و بیش ذرائع ہوں گے اُسی مناسبت سے معلومات فطرت میں برتی بھی ہوگی۔ اپنا رسالہ شائع کرنے سے اتنی ہی امید قائم کر سکتا تھا کہ یہ امر لوگوں پر واضح ہو جائے گا اور جو لوگ فہام کے خواہاں ہیں یعنی جو محض شہرت پسند اور ظاہر دار ہی نہیں بلکہ فی الحقیقت نیکی کی طرف مائل ہیں اگر کچھ اختیارات اپنی جگہ پر انجام دے چکے ہیں تو وہ اپنے نتائج افکار سے مجھے مطلع کرنے کی طرف مائل ہوں گے اور جو کام میرے لئے باقی ہے اُس میں مجھے مدد ملے گی۔

اُس کے بعد کچھ اور ہی وجوہ نظر اُسے اور میں نے اپنی رائے بدل دی۔ البتہ یہ خیال رکھا کہ جو نتائج مجھے حاصل ہوں اور کچھ بھی اہمیت رکھتے ہوں ان کی صداقت کی جانچ کر کے انہیں واقعی قلم بند کر لوں اور ان کی بھی اتنی ہی قدر

کروں جتنی کہ انھیں شائع کرنے کے ارادہ کی صورت میں کرتا۔ یہ  
 طرز عمل مجھے اس لئے اور بھی پسند آیا کہ قلم بند کرنے سے  
 ہر چیز کے جاننے کی گویا ایک مجبوری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ  
 دھڑکا یہ لگا رہتا ہے کہ جب دوسرے اس کے دیکھیں گے تو  
 گرفت کا موقع زیادہ ہو گا اور بارہا کا تجربہ ہے کہ کوئی غیر جب  
 پہلے پہل فرین میں آئی تو بہت سی مغلوم ہوئی اور جب اسے سمجھنے  
 بیٹھا تو اس کی غلطیاں آشکار ہونے لگیں مگر مفاد عام کو فروغ  
 دینے کا کوئی موقع اپنے حتمی المقصد و در میں نے ضائع نہیں کیا  
 ہے کیونکہ میرے بعد میرے مر قومات میں اگر کوئی قابل قدر  
 بات ہے تو دوسرے لوگ جن کے ہاتھ یہ چیزیں لگیں گی وہ از خود  
 اس کی قدر کریں گے۔ مگر میں نے یہ طے کر لیا کہ اپنی زندگی میں  
 ان کی اشاعت کی طرح قبول نہ کروں گا، کیونکہ میں اپنے اس وقت  
 کے ضائع کرنے پر تیار نہیں ہوں جو میں نے اپنی اصلاح کے لئے  
 الگ رکھا ہے اور میرے مر قومات سے ابھی باہر ہی جا  
 شہرست بھی ہو گی اس سے میرا وقت ضرور ضائع ہو گا۔ یہ  
 سچ ہے کہ شخص پر دوسروں کے مفاد کو ترقی دینا فرض ہے  
 دوسروں کے کام نہ آنا اور اصل ناکارہ ہونا ہے۔ مگر یہ بھی سچ  
 ہے کہ آج کے بعد کی فکر بھی چاہئے۔ جب ہمارا انشاء ان مقاصد  
 کو پورا کرنا ہو جو اخلاف کے حقوق میں بہت زیادہ مفید ہوں تو  
 اس کے مقابلہ میں ان کاموں کو ترک ہی کرنا اچھا ہے، جو  
 موجودہ نسل کے لئے شاید ہی فائدہ مند ہوں میں در حقیقت  
 راضی ہوں کہ سب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اب تک جو کچھ  
 میں نے لکھا وہ اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جتنسا کہ میں  
 نے نہیں لکھا ہے مگر جو کچھ نہیں لکھا ہے اس کے سیکھنے  
 کی اہمیت سے خود کو مایوس بھی نہیں پاتا۔ جو لوگ تدریج کے ساتھ

حقیقت کے متلاشی ہیں ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو دولت میں بڑھنے لگتے ہیں تو بڑے کام انجام دیتے ہیں اتنی وقت نہیں اٹھاتے جتنی وہ اپنے زمانہ افلاس میں چھوٹے کام انجام دیتے ہیں اٹھاتے تھے بلکہ ان کو لشکروں کے سپہ سالاروں سے تشبیہ کی جا سکتی ہے جن کی سپاہ فتوحات کے ساتھ بڑھتی ہے اور جو اگر بار بار جیتے تو جیتنے سے زیادہ اپنے باقی ماندہ دستوں کو متوجہ رکھنے کے لئے دوراندیشی سے کام لیتے ہیں اور پھر ملک کے ملک فتح کر لیتے ہیں۔ دراصل جو امرد وہی ہے جو علم حق کی راہ میں تمام دشواریوں اور غلطیوں پر غالب آنے کی کوشش کرے اور نامرد وہ ہے جو کسی اہم کام یا عموماً رکتے والے معاملہ میں غلط رائے کو تسلیم کر لے۔ انسان جب گمراہ ہو جاتا ہے تو دوبارہ راہ راست پر آنے میں اس کو بہت زیادہ ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح غلط رائے کے بان لینے کے بعد صحیح اصول پر حاوی ہونا بہت بڑی بات ہو جاتی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے اگر میں علوم میں کسی حد تک حقیقت رسی میں کامیاب ہوا ہوں تو میں یہ اعلان کر سکتا ہوں کہ میں ان پانچ یا چھ دشواریوں پر غالب آگیا جو اس راہ میں حاصل تھیں۔ یہ میرا ایک زبردست جہاد تھا جس میں پالا میرے ہاتھ رہا۔ اب میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ میرے منصوبے کے پورے ہونے میں اب جو کچھ ہے وہ اسی طرح کی دو چیزیں کامیابیاں حاصل کر کے پوری ہو سکتی ہے۔ میری عمر بھی ابھی کچھ زیادہ نہیں ہے اور حالات کے دیکھتے ہوئے کیا محب سے کہ میرا یہ مقصد پورا ہو جائے۔ چونکہ میں اپنے وقت کی قدر کرنا چاہتا ہوں اس لئے ضبط اوقات پر خود کو مجبور پاتا ہوں۔ اب میں اگر اپنے اصول طبیعات کی اشاعت کو اراکروں کو یقیناً بہت سی چیزیں پیدا ہو جائیں گی جن سے میرا وقت بہت ضائع ہو گا، اگر



میرے اصول طبیعات اس قدر صریحی ہیں کہ محض ان کا سمجھ لینا انھیں قبول کر لینے کے مراد ہوا اور ان میں سے ہر ایک اپنی دلیل آپ پیش کر کے گاتا ہم یہ تو ممکن ہی نہیں کہ جو متضاد اور اصول طبیعات کے بابت موجود ہیں ان سے میرے اصول بالکل مطابق ہوں اس لئے لامحالہ یہ خطرہ ہے کہ اس طرح جو اختلاف برائے گا وہ مجھ کو میرے مقصد عظیم سے اکثر ہٹا دیا کرے گا۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اختلافات ایک طرف مجھ کو میری غلطیوں پر متنبہ کریں گے اور دوسری طرف اگر میرے قیاسات میں کوئی قابل قدر بات ہے تو دوسرے لوگ اس کے سمجھنے پر توجہ کریں گے نیز یہ کہ ایک آدمی کی رائے سے کئی آدمیوں کی رائے ابھی ہوا کہ میری رائے جو لوگ آج میرے اصول سے فائدہ اٹھائیں گے تو کل اسے فائدہ سے مجھ کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔ لیکن اگرچہ میں خود کو خاطر سمجھنے میں پس و پیش نہیں کرتا اور پہلے پہل جو خیالات قائم کرتا ہوں ان پر کبھی بھروسہ نہیں کرتا تاہم میری رائے پر جو اعتراضات ممکن ہیں ان کا مجھے کچھ ایسا تجربہ ہو چکا ہے کہ میں یہ توقع قائم نہیں کرتا کہ میری رائے سے چنداں فائدہ منظور ہو گا مجھے رائے زنی کا کافی تجربہ ہے بلکہ اپنے عزیز دوستوں اور ان لوگوں کا بھی تجربہ ہے جن کے لئے میں ہمیشہ ایک غیر متعلق شخص بنا رہا اور ایسے اشخاص کا بھی تجربہ ہے جن کی خیانت اور حسد انھیں اس کوشش پر مجبور کرے ہوئے ہیں کہ جو محوڑا بہت میرے دوستوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہو اس کا پتہ ان کو لگ جائے مگر ایسا تو شاید ہی ہوا ہو گا کہ میں کسی ایسی چیز کو نظر انداز کر گیا ہوں جو اعتراض کے بعد میرے سامنے آئی ہو، البتہ اعتراض اگر موضوع سے بالکل ہٹا ہوا ہو تو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں غرض کہ مجھے کوئی ایسا تقاضہ نہ ملا کہ جہاں تک میری آرا کا تعلق ہے مجھ سے زیادہ سخت گیر اور مجھ سے بڑھکر منصف مزاج نظر آتا جس



قسم کے مباحث پر مدار سل میں مباحثے ہو کر رہتے ہیں ان سے کسی ایسی حقیقت پر روشنی نہیں پڑتی جو پہلے سے معلوم نہ ہو کیونکہ ایسی صورت میں ہر فریق دوسرے پر قہاریا ہوئے کی کوشش میں مسائل کے مختلف پہلوؤں پر جو دلائل پیش کرتا ہے انھیں وزن نہیں کرتا بلکہ محض احتمالات کو سر لہنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جو لوگ وکالت کے کام میں اچھے رہے ہوں وہ محض اپنی وکالت کی بنا پر بہتر حاکم نہیں بن سکتے۔ باقی میرے اظہار خیال سے اگر دوسروں کو فائدہ پہنچے گا تو اس کی مقدار زیادہ نہ ہو گی کیونکہ میرے خیالات ابھی اس حد تک نہیں پہنچے ہیں کہ کام میں لائے جانے کے قبل ان میں اضافہ کی جڑا گنجائش نہ پائی جائے۔ بلا شائبہ فخر میں کہہ سکتا ہوں کہ ابھی سے اگر میرے خیالات پر عمل شروع کیا جائے تو دوسروں سے زیادہ میں ہی اس میں کامیاب ہوں گا۔ میں نہیں کہتا کہ مجھ سے بہتر ذہنیت کے انسان دنیا میں زیادہ نہیں ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ اپنی دریافت کی ہوئی چیز پر انسان جیسا عمل کر سکتا ہے ویسا دوسرا نہیں کر سکتا اور میرے موضوع پر یہ بات یوں بھی صادق آتی ہے کہ مثلاً میں نے اپنے خیالات اکثر نہایت دقیق النظر لوگوں سے خود بیان کئے اور غور کرتا رہا کہ وہ نہایت خوبی سے سمجھتے بھی جاتے تھے مگر جب وہ لوگ میرے خیالات کو دہرائے تھے تو میں نے اکثر دیکھا کہ وہ اس قدر تغیر و مکر بیان کرتے تھے کہ میں پھر اپنی طرف ان کو منسوب نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنے اخلاف سے یہاں یہ استدعا کروں گا کہ محض غصے سنائے بغیر دوسرے کے میری طرف ہرگز کوئی بات منسوب نہ کریں تا وقتیکہ یہ تحقیق نہ کر لیں کہ اس کو خود میں نے شائع کیا ہے۔ ہر لئے فلاسفہ کی طرف بہت سی باتیں لوگ منسوب کرتے تھے آئے ہیں حالانکہ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کا کہیں پتہ نہیں تاہم کتابوں کے نہ ہو جو دوسرے سے لامحالہ میں یہ رائے نہیں قائم کرتا کہ

اُن کے خیالات واقعی لغو ہیں، کیونکہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ اپنے  
 زمانہ کے اکابر و رجال سے تھے البتہ یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ ان کے خیالات  
 صحیح طور پر ہمارے سامنے ادا نہیں کئے گئے ہیں۔ چنانچہ دیکھا گیا  
 ہے کہ قدیم فلاسفہ کے اتباع میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ان پر  
 سبقت لے گیا ہو۔ موجودہ زمانہ میں جو ارسطاطالیس کے زیر دست  
 بیرو ہیں ان کی بابت میرا پورا یقین ہے کہ اگر اسی کے برابر فطرت سے  
 واقفیت اُن کو حاصل ہو جائے تو وہ اسی پر قانع ہو جائیں گے اور  
 اس سے زیادہ حاصل کرنے کی خواہش نہ کریں گے۔ ان کی مثال  
 اس میل کی سی ہے جو کسی درخت پر چڑھا دی گئی ہو کہ وہ اس درخت  
 سے باہر ہو کر بڑھنا نہیں چاہتی اور اگر درخت کی پوری بلندی پر چڑھ  
 جاتی ہے تو اکثر نیچے کی طرف بھی پلٹ پڑتی ہے۔ میرے خیال میں  
 یہی رجحان پسندنی ان لوگوں میں بھی ہے اور یہ لوگ اگر مطالعہ  
 ترک کر دیں تو ان کی دانائی میں کوئی کمی نہ واقع ہو۔ یہ لوگ محض متن  
 کتاب پر اکتفا نہیں کرتے کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کو سمجھ لیں اور  
 قناعت کر لیں بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسی متن سے ان دشواریوں  
 بھی حل کر ڈالیں جن کے بارے میں مصنف نے ایک لفظ بھی نہ لکھا ہو گا  
 یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اسی کتاب میں سب کچھ موجود ہے یہ طریق تفلسف  
 انھیں لوگوں کو زیب دینا ہے جن کی استعداد حد تو سط سے گری  
 ہوئی ہے کیونکہ یہ لوگ ابہام سے کام لیکر اس لائق ہو جاتے ہیں کہ  
 ہر بات پر اسی اعتقاد کے ساتھ تقریر شروع کر دیتے ہیں کہ گویا وہ ہر چیز  
 سے واقف ہیں حتیٰ کہ اپنے موضوع پر جو کچھ خود کہتے ہیں اس کی حمایت  
 باریک میں اور ہوشیار ترین مخالف کے مقابلہ میں بھی اس طرح  
 کر سکتے ہیں کہ ان کی گرفت ہر ایک نہ کر سکے۔ میرے نزدیک ان  
 لوگوں کی کیفیت ایک اندھے کی سی ہے جو آنکھوں والے سے برابر کی  
 نبرد آزمائی کے لئے اسے بھی ایک تاریک غار میں اتار لے جائے۔

فلسفہ کے جن اصول سے میں کام لیتا ہوں ان کا نہ شائع ہونا ہی ایسے  
 لوگوں کے حق میں بہتر ہے۔ جب یہ اصول نہایت سادہ اور صریح  
 ہیں تو میرا ان کو شائع کرنا بہت کچھ ایسا ہی ہے جیسے ان جنگ آزماؤں  
 کے تاریک غار میں روشنی لانا اور جو لوگ اعلیٰ قابلیت  
 رکھتے ہیں تو ان کو بھی میرے اصول چاہئے جس کے لئے کچھ تشویش نہ ہونا  
 چاہئے کیونکہ ان سے اگر ان کا منشاء یہ ہے کہ وہ ہر امر پر تقریر کر سکیں  
 اور ان کی علمیت کا چرچا ہو جائے تو ان کا مقصد یوں زیادہ آسانی سے  
 پورا ہو گا کہ وہ ناشکی صداقت پر اکتفا کریں جو ہر قسم کے مناطات میں  
 بلا زحمت دکھائی جاسکتی ہو اور حقیقت کی تلاش میں ان کو سرگرداں  
 ہونے کی ضرورت نہیں تا کیونکہ یہ جو ہر رفتہ رفتہ بے نقاب ہوتا ہے  
 اور وہ بھی صرف چند شعبوں میں جس کے لئے شرط اول اپنی لاعلمی کا  
 اعتراف ہے۔ اب اگر کوئی شخص منصف چند حقائق سے واقف ہوئے کہ  
 اس فخر پر ترجیح دیتا ہے کہ کسی سے ناواقف نہیں ہے تو ایسا  
 کرنا بہت زیادہ پسندیدہ ہو گا۔ اور اگر میرا ہی طرز عمل اختیار کرنا پسند  
 ہو تو جو کچھ میں موجود وہ بحث میں کہہ چکا ہوں وہ اس کے لئے کافی ہے  
 اگر کسی میں مجھ سے زیادہ اطمینان ہے تو جو ترقی میں نے کی ہے وہ خود  
 کر سکتا ہے اور جو کچھ میں نے دریافت کیا ہے اسے وہ خود دریافت  
 کر سکتا ہے اور جو کچھ مجھے اب تک دریافت نہیں ہوا ہے وہ جائے  
 خود و اصل نہایت دشوار ہے کیونکہ میں نے اپنی تحقیق بغیر ترتیب کے  
 کبھی جاری نہیں کی تھی اپنے لئے جو کام میں طمانیت کا پہلو نہ یا وہ  
 ہوتا ہے اور سہل چیزوں کا ڈھونڈنا اور پھر اہستہ اہستہ زمین  
 پر زمینہ و شوار ترکی جانب ترقی کرنے کی عادت یہ چیزیں لوگوں کو  
 میری ساری تعلیم سے زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔  
 اپنے معاملہ میں مجھے ماننا پڑا کہ جملہ حقائق جو مجھے اتنی مدت میں  
 تلاش کی تلاش کے ساتھ حاصل ہوئے ہیں اگر مجھے نو عمری میں بغیر

اس قدر محنت کے سکھا دے جاتے تو ان کے علاوہ شاید مجھے کچھ اور نہ آتا۔ کم از کم یہ عادات اور مہولت جو جدید تحقیقات میں مجھے محسوس ہوتی ہے اور جوں جوں میں انہماک کے ساتھ تحقیق میں مصروف ہوتا ہوں بڑھتی جاتی ہے، کبھی میری ہوتی غرضکہ دنیا میں اگر کوئی کام ایسا ہے جسے دوسرا شخص اتنی خوبی سے انجام نہیں دے سکتا جتنا کہ اس شخص کا شروع کرنے والا وہی ہے جس کے لئے میں اتنی مشقت اٹھا رہا ہوں۔ یہ بے شک صحیح ہے کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے جو اختیارات مفید ہیں ان سب کو انجام دینے پر کوئی شخص قادر نہیں ہو سکتا لیکن اس میں بھی کوئی چیز مزاحم نہیں کہ بلا مدد وغیرہ کوئی شخص ایسے ہی قوت بازو پر بھروسہ کرے کہ اس کام میں منہمک ہو اور عند الضرورت کاریگروں اور اسی قبیل کے دوسرے لوگوں سے مدد لے جنہیں نفع کی امید دلا کر بہتر کام لیا جاسکتا ہے کیونکہ اجرت دینا بھی بہتر کام لینے کا ایک ذریعہ ہے اور اگر کوئی علم کے شوق سے از خود اپنی خدمت پیش کرے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ایسے لوگوں کے وعدے بالعموم ان کے عمل سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں، ان کے منصوبے تو بہت اچھے ہوتے ہیں، لیکن پورے بہت کم ہوتے ہیں۔ علاوہ ان میں ایسے لوگوں کو اپنی زحماتوں کے بدل کی توقع و شواہدوں کے مبالغہ آمیز ذکر یا تحسین و آفرین کے سے فضول کلمات تک کی صورت میں ہوتی ہے، اس کے لئے آدمی بغیر اپنا نقصان کئے ہوئے اپنے وقت کا کوئی حصہ نہیں صرف کر سکتا۔ جو اختیارات دوسرے لوگ انجام دے چکے ہیں اگر وہ ظاہر بھی کر دیں (بشرطیکہ ان کو راز میں نہ رکھنا مقصود ہو) تو ان میں اس قدر فضولیات و زوائد شامل نظر آئیں گے کہ اصل حقائق کو لواحق سے تمیز کرنا مشکل ہو گا۔ علاوہ بریں یہ اختیارات گویا فی الجملہ ایسے بدنام بلکہ غلط ہوں گے کہ ان میں سے اگر کوئی مفید مطلب بھی ہو، تو اس کی تلاش میں جو وقت صرف ہوا اس کا کفارہ نہیں ادا ہو سکتا۔

اگر یقینی طور پر معلوم ہو کہ کوئی شخص نہایت مفید اکتشافات عمل میں لائے کی اہلیت رکھتا ہے اور اس بنا پر دوسرے لوگ بھی اس منصوبہ میں اسے کامیاب بنانے میں امداد کرنا چاہتے ہیں تو وہ بھی اس کی صرف اسی قدر مدد کر سکتے ہیں کہ اس کے اختیارات کے ضروری مصارف کی کفالت کر لیں یا یہ کہ اس کے اوقات میں دوسروں کی ناوقت خلل انداز ہی سے اسے نجات دلائیں مگر میں اپنی جگہ پر نہ تو خود کو اس لائق سمجھتا ہوں کہ کوئی غیر معمولی و عمدہ کمزوریوں اور نہ اس قسم کے فضول اوہام میں پڑتا ہوں کہ میرے منصوبوں میں ضروری دیکھ بھال لیں گے اور یہ کیفیت میں اس قدر دنی الطبع بھی نہیں ہوں کہ لوگوں کی اس مراعات کو گوارا کروں جس کی اہلیت مجھ میں نہیں ہے۔

فی الجملہ انھیں وجوہ سے پچھلے تین سال میں مجھے اپنا وہ رسالہ شائع کرنے کی جرات نہیں ہوئی حالانکہ وہ تیار رکھا ہے، اسی کے ساتھ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اگر کوئی اور رسالہ بھی میں نے ایسا لکھا جس سے میرے اصول طبیعیات کا پتہ چل سکے تو اسے بھی اپنی زندگی میں شائع نہ ہونے دوں گا۔ البتہ اس عرصہ میں وجوہ ایسے پیدا ہوئے ہیں کہ میں اس سلسلہ میں بعض جزئی مثالیں پیش کرنے اور اپنے کاموں اور منصوبوں کا حال بتانے پر اب آمادہ ہو گیا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر میں ایسا کرنے سے قاصر رہا تو جو لوگ پہلے میری کتابوں شائع کرنے کے قصد سے واقف تھے میرے مابعد کے عذرات کو چند ان معقول نہ خیال کریں گے جو میں غیر معمولی طور پر شان و شوکت کا طالب نہیں بلکہ سچ بوجھے تو ان چیزوں سے اس لئے متنفر ہوں کہ ان سے سکون خاطر میں فرق پڑتا ہے تاہم مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ اپنے افعال کو جرائم کی طرح پوشیدہ رکھوں اور نہ میں نے کبھی اس کی احتیاط کی کہ ہمیشہ پر وہ گمنامی میں پڑا رہوں کیونکہ ایسی روش کو خود اپنے خلاف ایک گناہ سمجھتا رہا بلکہ میرے لئے یہ ایک کرب کا باعث ہو تا جو پھر میرے



اطمینان ملی میں فعل انداز ہوتا۔ مگر اس گمنامی یا شہرت سے بے نیاز رہنے کے باوجود میں اپنے کو شہرت حاصل کرنے سے باز نہ رکھ سکا۔ البتہ میں نے اپنا فرض مقرر کر لیا تھا کہ اپنے کو یہ نامی سے بچاؤ کی کوشش کروں گا۔ دوسری وجہ جس نے مجھے فلسفہ کے ان نمونوں کو قلمبند کرنے پر مجبور کیا یہ ہے کہ مجھے یہ تاخیر نہایت ناگوار ہو رہی تھی جو ذرا کی گئی سے اختیارات کے انجام دینے میں ہو رہی تھی ضرورت یہ محسوس ہوتی تھی کہ دوسرے لوگ میرا ہاتھ بٹائیں جس کے بغیر میں اپنے آپ کو تعلیم دینے کا منصوبہ پورا نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنے کو بڑا نہیں سمجھتا، کہ لوگوں کے اپنی دیکھو میں بہت زیادہ حصہ لینے کی توقع رکھوں لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ میرے بعد والے مجھ پر یہ الزام لگائیں کہ اگر وہ میرے منصوبے جانتے ہوئے تو میری اتنی مدد کرتے کہ میں اپنے کام کو بہت جلد آگے بڑھا لے کیا ہوتا۔

میں نے ایسے امور کو اپنے لئے منتخب کرنا بہتر سمجھا جن سے نہ تو چنداں تنازعات پیدا ہوں اور نہ ان کے ظاہر کرنے سے وہ سب ظاہر ہو جائے جسے میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا اور پھر بھی کافی وضاحت کے ساتھ دکھا دوں کہ میں علوم کے اندر کیا کر سکا ہوں اور کیا نہیں۔ باقی اس میں کسی حد تک کامیاب ہوا یا نہیں یہ میرے کہنے کی بات نہیں۔ اپنی تصنیفات کا ذکر کر کے میں دوسروں کی رائے سے متاثر کرتا نہیں چاہتا بلکہ ان کی تنقید میرے لئے موجب شکر گزاری ہوگی اور جو لوگ مجھ پر اعتراض کریں ان کی ترغیب مزید کے لئے میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تکلیف کر کے اپنے اعتراضات میرے شائع کنندہ کے پاس بھیج دیں جو مجھے اس کی اطلاع کر دے گا اور میں کوشش کروں گا کہ ان کے اعتراضات کے ساتھ اپنے جوابات بھی شائع کرادوں۔ قارئین دو نوں کو ایک ساتھ ملاحظہ کرنے زیادہ آسانی سے فیصلہ کر سکیں گے کہ حق کس کے ساتھ

ہے۔ میں کسی طویل جواب نہیں دیتا اور جب قائل ہو جاتا ہوں تو بلا تکلف اپنی غلطی تسلیم کر لیتا ہوں یا اگر اپنی غلطی میری سمجھ میں نہ آئی تو جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کی ضروری حمایت صراحت الفاظ میں کرتا ہوں اور اس میں کسی سے عواو کا اضافہ نہیں کرتا تا کہ پھر بات میں بات نہ ملے اور ختم ہی نہ ہونے میں آئے۔

اگر ان میں ایسے امور جن کا ذکر میں نے بصریاتی یا شہابیات میں کیا ہے پہلی نظر میں ناگوار معلوم ہوں تو میری خواہش سے کہ انہیں عبور و توجہ سے دیکھا جائے کیونکہ میں خود ان کو مفروضات کہتا ہوں اور ان کے ثبوت کی طرف سے بے پرواہ نظر آتا ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ کل کے مطالعہ کے بعد جو کچھ مذکور ہو گا وہ اطمینان سے بدل جائے گا۔ ان رسائل میں جو دلائل ہیں اس قدر ایک دور سے دیکھ کر سے ہوئے ہیں کہ ہر علت اپنے معلول سے اور ہر معلول اپنی علت سے ثابت ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس ضمن میں میں اس معاملہ میں مبتلا ہو گیا ہوں جسے منطق والے دور سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ تجربہ ان معلومات میں سے اکثر کو جو نہایت متیقن قرار دیتا ہے اس لئے جن علل سے مستنبط ہیں وہ علل ان کی حقیقت ثابت کرنے میں اتنے کارآمد نہیں ہوتے جتنے کہ ان کے وجود کی توجیہ کرنے میں۔ برعکاس اس کے خود ان علل کی حقیقت ان کے معلومات کی حقیقت سے ثابت ہو جاتی ہے۔ ان چیزوں کو میں نے مفروضات میں کچھ اس لئے نہیں شمار کیا ہے کہ میں ان کو ان حقائق اولیہ سے مستنبط نہیں کر سکتا ہوں جن کا بیان اوپر ہو چکا ہے میں تو یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ایسا ہو سکتا ہے مگر یہ کہ میں نے ایسا نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں ایک خاص قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کو یہ موقع دینا نہیں چاہتا کہ جو کچھ وہ چاہیں بطور میرے اصول کے مان کر اس پر کسی لغو فلسفہ کی بنیاد وہیں سے قائم کر دیں اور اس کا

الزام میری گردن پر لادویں۔ میرے مشارالہ یہاں وہ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو سوچنے میں کسی کو بیس برس لگ گئے اس سب پر وہ ایک ہی زبان میں اور اس موضوع کے زبان پر اتنے ہی جاوی ہو سکتے ہیں، تاہم مخاطب وہ لوگ ہیں جو جیسے باریک ہیں اور شکستہ مزاج ہیں وہ کسی غلطیوں میں پڑنے کی استعداد زیادہ اور اس حقیقت کی صلاحیت کم رکھتے ہیں۔ جو خیالات کا متر میرے اور واقعی میرے ہیں ان کی تعریف میں جدید کہہ نہیں سکتا۔ میں تو یہ کہتا ہوں اگر ان کی توجہ زیادہ ہوتی ہے تو وہ اس قدر سادہ ہوتے اور عقل سلیم ان کی اس درجہ تاہید کرے گی کہ وہ نسبتاً بالکل معمولی اور غیر مبہم معلوم ہوں گے۔ میرا یہ بھی دعویٰ نہیں کہ سب سے پہلے میں نے ہی ان خیالات کو ظاہر کیا، البتہ میں نے ان کو اختیار فرمایا۔ کیا مگر نہ اس بنا پر کہ یہ کسی دوسرے کے خیالات ہیں اور نہ اس لئے کہ یہ کسی دوسرے کے خیالات نہیں ہیں بلکہ صرف اس لئے کہ عقل نے انکی صداقت ظاہر کی اور میں قائل ہو گیا۔

اپنی صفت و حرفت اگرچہ اس ایجاد کو فوراً کام میں نہ لاسکیں گے جس کی توجہ میں نے شہابیات کے ذیل میں کی ہے مگر اس سے اس ایجاد پر کوئی حرف نہیں آتا جس کل کا بیان میں نے کیا ہے اسکو بنانے اور جاننے کے لئے مشق و مہارت و درکار ہے۔ اگر کوئی کارگر پہلی ہی کوشش میں ایسا کرنے پر قادر ہو جائے تو یہ اسی قدر حیرت کی بات ہے جیسے کوئی محض چند ٹرانسپیرنٹ نظر رکھ کر ستارہ جاننے لگے۔ اور بجائے لاطینی زبان اختیار کرنے کے جس میں میرے متقدمین لکھا کرتے تھے میں نے اپنی علی زبان فرانسسی میں اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جو لوگ محض قدما کی تصانیف پر دست کر رہے ہیں ان کے مقابلہ میں وہ لوگ میرے خیالات کے بہتر سمجھنے والے ہوں گے جو عقل سے بلا تصنع کام لیتے ہیں اور عقل سلیم کے ساتھ

ساتھ مطالعہ کی عام عادت بھی رکھتے ہیں۔ میرے حکم وہی لوگ ہیں جو  
 لاطینی کے اس درجہ طرفدار نہیں کہ میرے دلائل پر غور کرتے سے صرف اس  
 پتہ پر انکار کر دیں کہ میں راج زبان میں اظہار خیال کرتا ہوں۔  
 آخر میں میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے علوم میں آئندہ ترقی کی  
 جو امید ہے اس کی بابت کوئی متعین بات تو زبان سے نہ نکالوں گا نہ  
 کوئی ایسا عہد قلمبند کروں گا جس کا پورا ہونا یقینی نہ ہوتا ہم اتنا ضرور  
 کہہ سکتا کہ میں جب تک زندہ رہوں گا سوائے علم فطرت حاصل کرنے کی  
 کوشش کے کسی مشغلہ میں نہ پڑوں گا اور وہ مشغلہ یہی ہو گا کہ زمانہ موجودہ  
 کے علم طب کے قواعد جو آج کل رائج ہیں ان سے نہایت موثق قواعد  
 مستنبط کروں۔ نیز یہ کہ دوسرے مشاغل کی طرف میرا میلان طبع نہیں ہے  
 اور خاص کر ایسے مشاغل جن میں پڑ کر بغیر دوسروں کو نقصان پہنچائے  
 ہوئے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا، بلکہ میرا خیال ہے کہ اگر میں ان میں  
 پڑوں بھی تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ جانتا ہوں کہ اس کا دنیا میں مجھے  
 کوئی معاوضہ نہیں ملے گا مگر معاوضہ کی مجھے پروا بھی نہیں۔ اور جو لوگ  
 دنیا کی بڑی سی بڑی نعمتیں مجھے دے سکتے ہیں ان کا میں اسی صورت  
 سے احسان مند ہو سکتا ہوں کہ وہ مجھ پر اس سے زیادہ عنایت  
 نہ کریں کہ مجھے میرے کنج عزالت میں پڑا رہنے دیں اور میرے  
 لطف تنہائی میں خلل انداز نہ ہوں۔

# تفکرات فلسفہ

## فلسفہ اولیٰ

### خدمتِ اقدس علماءِ شعبہٴ دینیات پیریں

عالیجناب یہ اوراق ذیل جس خیال سے پیش کر رہا ہوں ان کی غرض کے معلوم ہونے کے بعد مجھے کو یقین ہے کہ آپ حضرات کی پوری تائید حاصل کریں گے، اور ان کی بہترین سفارش آپ سے یہی ہو گی کہ ان کے مقصد کو چند لفظوں میں بیان کر دوں۔

خدا اور روح کے متعلق ہمیشہ سے میرا خیال رہا ہے کہ یہاں امور میں سب سے زیادہ اہم اور مقدم ہیں جن کا اثبات و دینیات کے بجائے فلسفیانہ و لائیکل سے ہونا چاہیے کہ ہم ایمان والوں کے لئے اگرچہ عقیدہٴ یہ مان لینا کافی ہے کہ خدا موجود ہے، اور انسانی روح جسم کے ساتھ فنا نہیں ہوتی، تاہم کافروں کو کسی مذہب کے قبول کرنے یا کسی نیکی تک کو تسلیم کرنے کے لئے ہم اس وقت تک ہرگز آمادہ نہیں کر سکتے جب تک پہلے ان دو باتوں کو فطری دلیل سے ثابت



نہ کرویں۔ اور چونکہ اس زندگی میں آدمی کو اکثر تنگی سے بدی میں زیادہ نفع ہوتا  
 ہے، اس لئے اگر خدا کا خوف یاد دہانی کی توقعات نہ ہوں تو مشکل  
 ہی سے کوئی شخص حق کو نفع پر ترجیح دے گا۔ یہ بالکل سچ ہے کہ ہم کو خدا پر  
 اس لئے ایمان لانا چاہئے کہ کتب مقدسہ میں اس کی تعلیم ہے، اور کتب  
 مقدسہ کو اس بنیاد پر ماننا چاہئے کہ یہ خدا کی اُمتاری ہوئی ہیں اس لئے کہ  
 ایمان خدا کا ایک متصل ہے، جو ذات ہم کو دوسری چیزوں کے  
 یقین کی توفیق دیتی ہے، وہی خود اپنے وجود پر یقین کی توفیق بھی عطا کر سکتی  
 ہے، لیکن کافروں کو ہم اس طریقہ سے قائل نہیں کر سکتے۔ وہ تو اسکو  
 وہی مغالطہ خیال کریں گے جس کو منطقی داور کہتے ہیں۔ نیز میں اچھی طرح  
 جانتا ہوں کہ آپ حضرات اور دیگر علمائے دین نہ صرف اس  
 امر کا یقین رکھتے ہیں کہ خدا کو فطری دلیل سے ثابت کیا جاسکتا  
 ہے، بلکہ اس امر کا بھی، کہ خود کتب مقدسہ سے معلوم ہوتا ہے کہ  
 خدا کا علم بہترین مخلوقات کے علم سے کہیں زیادہ بین ہے۔ بلکہ واقعہ  
 یہ ہے کہ خدا کا جاننا اس قدر آسان ہے کہ جو نہیں جانتا وہ جہر ہے،  
 جیسا کہ کتاب دانش باب (۱۱) میں کہا گیا ہے کہ جہل قابل معافی نہیں،  
 کیونکہ جب انسان کا ذہن مخلوقات عالم میں اتنی گہرائی تک جاسکتا ہے،  
 یہ کیسے ممکن ہے کہ خالق عالم اور رب العالمین کو وہ اس سے زیادہ آسانی  
 کے ساتھ نہ پہچان سکتا ہو؟ رویوں کے نام کے خط باب  
 (۱۱) میں ہے کہ ”کہا گیا ہے، کہ ان کے پاس کوئی عذر نہیں  
 ہے“ پھر اسی مقام کے ان الفاظ سے، کہ ”خدا کا علم  
 ان کے اندر ظاہر ہے“ ہم کہنتہ کیا گیا ہے کہ خدا کو متعلق جو چہ جانا  
 جاسکتا ہے، وہ ایسے دلائل سے ثابت ہو سکتا ہے جو ہمیں  
 فوراً نظر نہیں آتے بلکہ خود ہمارے ہی اندر سے نکالے جاسکتے ہیں۔  
 اس لئے خیال ہوا کہ اگر میں یہ ثابت کر دکھاؤں کہ اپنی  
 ذات سے باہر کے بغیر ہم خدا کو کیوں نہ کر اور کس طرح دنیا کی چیزوں

سے زیادہ آسانی و قطعیت کے ساتھ جان سکتے ہیں ، تو یہ  
 ایک فلسفی کے فریضہ کے کچھ خلافت نہ ہو گا ۔ اسی طرح روح  
 کے بارے میں گو اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی حقیقت کا  
 جاننا سہل نہیں بلکہ بعض تو یہاں تک جرات کرتے  
 ہیں کہ انسان کی عقل تو کہتی ہے ، کہ یہ جسم کے ساتھ فنا ہی  
 ہو جاتی ہے ، اور صریح منہ سے یہ سبب کا عقیدہ اس کے خلاف  
 ہے ، بایں ہمہ جو کچھ لیٹرن کوئل نے جو لیو و هم کے زیر صدارت  
 منعقد ہوئی اپنے اجلاس ہشتم میں ان لوگوں پر لعنت ملا مت  
 کی ہے ، اور عیسائی فلاسفہ کو صاف طور پر حکم دیا ہے کہ  
 ان کے دلائل کا جواب دیں ، اور صداقت کو اپنی پوری طاقت  
 کے ساتھ واضح کر دیں ، لہذا میں اس کتاب میں اس خدمت کو  
 انجام دینے کی ہمت کرتا ہوں علاوہ ہر میں مجھ کو معلوم ہے کہ  
 اکثر بدوین آدمی خدا کو ماننے اور روح کے جسم سے  
 علیحدہ وجود کا اس لئے انکار کرتے ہیں ، کہ ان باتوں کو آج تک  
 ان برہانی طور سے نہیں ثابت کیا جا سکا ہے ، گو یہ خیال  
 صحیح نہیں ، بلکہ میرے نزدیک تو بڑے بڑے لوگوں نے  
 جتنے ثبوت اس بارے میں پیش کئے ہیں اگر سمجھ سے  
 کام لیا جائے تو وہ سب کرب براہین ہی ہیں اور کوئی نئی برہان  
 پیدا کرنا قریب ناممکن ہے تاہم میرا اعتقاد ہے کہ فلسفہ کا  
 کوئی کارنامہ اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا کہ ان میں سے  
 بہترین ثبوتوں کو تلاش کر کے اسی طرح مرتب کر دیا  
 جائے کہ آپس دہ دنیا پھر کبھی ان کے حقیقی براہین ہونے  
 میں کلام نہ کر سکے ۔ سب سے آخر یہ کہ اکثر لوگوں نے اس کی  
 مجھ سے خواہش کی ہے ، جو سمجھتے ہیں کہ ہر طرح کی علمی و شعاریوں کے  
 لئے میں نے ایک نیا ہیج و طریقہ نکالا ہے ، گو دراصل یہ نیا نہیں ، گو صداقت

زیادہ دنیا میں کوئی شے پرانی نہیں) جس کو میں نے دوسری چیزوں  
 میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے لہذا خیال ہوا کہ میرا فرض  
 ہے کہ اس طریقہ سے ایسی اہم شے میں بھی ضرور کام لینا چاہیے  
 فرض اپنے اس ہیج و طریق سے جو کچھ بھی میں معلوم کر سکا  
 ہوں وہ سب رسالہ ہذا میں پیش کر دیا ہے۔ میں نے یہ نہیں کیا  
 کہ اس اہم و عظیم موضوع کے جتنے مختلف ثبوت و دلائل فراہم  
 ہو سکتے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے کیونکہ اس کی ضرورت  
 انہی چیزوں میں پڑتی ہے جن کے لئے صحیح و قطعی دلیل کوئی ایک  
 بھی نہیں موجود ہوتی۔ میں نے صرف اہم و خاص دلائل پر  
 اس طرح بحث کی ہے کہ ان کو نہایت ہی یقینی و واضح براین  
 کی حیثیت سے پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں۔ مزید برآں میرا  
 دعوے ہے کہ انسانی ذہن کسی اور طریقہ سے ان سے بہتر دلائل  
 نہیں معلوم کر سکتا۔ میں معمولاً اسی طرح کی صاف کوئی کا عادی  
 نہیں لیکن زیر بحث موضوع کی اہمیت اور خدا کی عظمت  
 مجھ کو اس دعوے پر مجبور کرتی ہے۔ بالآخر جو یقین و قطعیت  
 میں ان دلائل میں پایا ہوا ہے یہ نہیں سمجھتا کہ ہر شخص اس کو  
 پاسکتا ہے۔ لیکن جس طرح ہندو میں ایشوریش، اپالو نیوں  
 یا پوس، ویشو کے بہت سے ایسے براین ہیں جو اگرچہ قطعی  
 یقینی تسلیم کئے جاتے ہیں کیونکہ ان میں کوئی ایسی بات  
 نہیں ہوتی جو اپنی جگہ سیر الفہم نہ ہو اور ہر قدم پر نتائج اپنے  
 مقدمات سے جکڑے ہوئے ہیں تاہم چونکہ یہ ذرا طویل ہوئے  
 ہیں اور کمال توجہ چاہتے ہیں اس لئے بہت مختصر سے لوگ  
 ان کو سمجھتے اور ذہن نشین کر سکتے ہیں اسی طرح جن دلائل کو  
 میں یہاں استعمال کرونگا گو بجائے خود وہ براین ہندوئیہ کے برابر  
 بلکہ میرے نزدیک ان سے بہتر یقینی و قطعی ہیں تاہم مجھ کو اندیشہ ہے

کہ بہت سے لوگ ان کو صحیح طور سے نہ سمجھ سکیں گے۔ ایک تو  
 اس لیے کہ یہ کسی قدر طویل اور ایک دوسرے پر موقوف ہیں اور  
 خاص کر اس لئے کہ یہ ایسا ذہن چاہتے ہیں جو تمام تعصبات سے  
 پاک ہو اور حواس سے اپنے کو آسانی کے ساتھ منقطع کرے سکے۔  
 سچ یہ ہے کہ دنیا میں بہت کم ذہن ایسے ہیں جو مابعد الطبیعیات  
 میں اسی طرح چل سکتے ہوں، جس طرح ہندسہ میں چلتے ہیں۔  
 اس کے علاوہ ایک اور فرق بھی ہے، وہ یہ کہ ہندسہ کی نسبت  
 چونکہ ہر شخص کا یہ خیال ہو گیا ہے کہ اسی میں جو کچھ ہوتا ہے  
 وہ قطعی برائین ہی پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے جو لوگ اس میں  
 پوری مہارت نہیں بھی رکھتے، وہ محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ  
 سمجھ گئے ہیں، اکثر سچ کے رد کرنے سے زیادہ جھوٹ کے قبول  
 کرنے میں غلطی کرتے ہیں فلسفہ کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس  
 ہے، اس کی چونکہ ہر شخص کو آدمی ظنی خیال کرتا ہے، اس لئے بہت  
 کم لوگ تلاش حق کے درپے ہوتے ہیں، اس پر ستم یہ کہ اپنے کو  
 بڑا مجتہد و صاحب فکر مشہور کرنے کے لئے مین سے مین خلاق  
 کو جھٹلانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اور اہم سے اہم صداقت  
 کی تکذیب اور اس پر اعتراض ہی کو بڑا کارنامہ خیال کرتے ہیں۔  
 یہی سبب ہے کہ میرے دلائل خواہ کتنے ہی قوی ہوں  
 مگر ان کا تعلق چونکہ فلسفہ سے ہے، اس لئے جب تک آپ  
 حضرات کی حمایت حاصل نہ ہو، امید نہیں کہ لوگ ان کا  
 کچھ زیادہ اثر قبول کریں۔ آپ کی جماعت کا دلوں میں اتنا اثر  
 اور سادہ دلوں کے نام کو اتنا اقتدار حاصل ہے کہ لوگوں نے کبھی  
 کسی دوسری جماعت کا اتنا لحاظ نہیں کیا صرف دین ہی کی باتوں  
 میں نہیں بلکہ (محاسن مقدمہ کے بعد) فلسفیانہ مسائل میں بھی۔  
 اور چونکہ ہر شخص نفس میں رکھتا ہے کہ اس قدر علم و عقل دیانت و

متانت کا کسی اور گروہ کے فیصلوں میں پایا جانا ناممکن ہے، لہذا  
 بطور ذیل کو اگر صرف اتنی توجہ نصیب ہو جائے کہ آپ حضرات  
 ایک بار اصلاح کی نظر سے ملاحظہ فرمائیں (کیونکہ میں اپنے ضعف  
 و جہل سے آگاہ ہوں) اور یہ سمجھنے کی جرأت نہیں کرتا کہ یہ اعلاط  
 سے پاک ہو گی) اور جن باتوں کی کمی ہو، ان کا اضافہ فرمادیں،  
 جو ناقص ہوں ان کو دور فرمادیں، اور جہاں توضیح و تشریح کی  
 ضرورت ہو زیادہ شرح فرمادیں یا کم از کم خود مجھکو ان خامیوں  
 سے مطلع فرمادیں، تاکہ ان کو رفع کر سکوں، اور سب سے آخر در خواست  
 یہ ہے کہ جن دلائل سے میں نے ثابت کیا ہے کہ خدا موجود ہے  
 اور انسان کی روح اس کے جسم سے علیحدہ وجود رکھتی ہے جب  
 یہ صحت و وضاحت کی اس سطح تک پہنچ جائیں جہاں ان کو براہین قطعیہ  
 میں شمار کیا جاسکے (اور میرے نزدیک اسی سطح تک ان کو پہنچایا  
 جاسکتا ہے) اس وقت اگر آپ حضرات ان کی صحت و صداقت پر  
 اپنی تائید و توثیق کی ہر ثبت فرمادیں تو مجھکو ذرا شک نہیں کہ  
 ساری غلطیاں اور باطل خیالات لوگوں کے ذہن سے نکل جائیں گے۔  
 کیونکہ صداقت تمام ارباب علم و فہم کو آپ کے فیصلہ کے آگے جھکا  
 دے گی، اور ملاحظہ جن کو ارباب علم و فہم نہیں زیادہ کھینچتا ہے وہ  
 اپنی تکذیب و تردید کی خو کو چھوڑنے پر مجبور ہوں گے، بلکہ کیا  
 عجب ہے کہ یہ خود ہماری صف میں آکر شریک ہوں، اور ان  
 دلائل کی تائید کرنے لگیں، جن کو ایسے بڑے بڑے عقلا براہین  
 خیال کرتے ہیں، مگر اس خوف سے کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھنے  
 لگیں، کہ یہ پیچیدہ ان دلائل کی فہم ہی سے قاصر ہیں نتیجہ یہ  
 ہو گا کہ بالآخر تمام لوگ ایسی عظیم الشان تائید کے سامنے پیرا ہونگے  
 ہو جائیں گے، اور پھر نہ کوئی شخص خدا کی ہستی میں شک کی  
 جرأت کرے گا اور نہ اس میں کہ انسان کی روح و جسم ایک



دوسرے سے مختلف و جداگانہ چیزیں ہیں۔  
 اگر یہ یقین ایک مرتبہ اچھی طرح راسخ ہو گیا، تو اس کے  
 منافع کا فیصلہ آپ ہی حضرات کے ہاتھ میں ہے، جو جانتے ہیں،  
 کہ ان حقائق میں شک سے کیا ایتریاں پیدا ہوتی ہیں۔ میرا متنبہ  
 نہیں، کہ خدا اور دین کے کام کی ان لوگوں کی خدمت میں اب  
 مزید سفارش کروں، جو ہمیشہ اس کے سب سے زیر دست حامی  
 رہے ہیں۔



# قارئین کتاب سے

## مصنف کی

## گزارش

”کتاب طریق“ جو ۱۹۳۷ء میں فرانسیسی میں شائع ہو چکی ہے اس میں خدا اور انسانی روح کے سوالات پر کچھ اشارات کر چکا ہوں لیکن وہاں تفصیلی گفتگو مقصود نہ تھی، محض یہ دیکھنا تھا کہ لوگ کیا رائے قائم کرتے ہیں، تاکہ آئندہ اسی کے مطابق بحث کروں کیونکہ میرے نزدیک یہ دونوں سوالات اس درجہ اہم ہیں کہ ان میں سے ہر ایک سے زائد بار ہی گفتگو مناسب تھی۔ اور جو راہ ان کی توجیہ کی میں نے اختیار کی ہے، وہ اتنی اچھوتی اور عام راستہ سے اتنی الگ ہے کہ میں نے اپنے خیالات کا اظہار فرانسیسی میں، جس کو ہر کس و ناکس پڑھ سکتا ہے، مفید نہیں چلنا، کہ کہیں ادنیٰ و ملغ کے لوگ بھی اس پر اپنی طبعانی نہ خرچ کرنے لگیں۔

کتاب طریق میں لوگوں سے میں نے درخواست کی تھی کہ اگر کوئی قابل اعتراض بات نظر آئے تو ازراہ کرم مجھ کو مطلع فرمائیں۔ دو کے سوا اور کوئی لائق اعتراض نہیں کیا گیا۔ تفصیلی

بحث شروع کرنے سے پہلے 'ان دونوں کا چند لفظوں میں جواب  
 دیدیا جاتا ہوں۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ انسان کا ذہن اپنے  
 اوپر غور کرنے سے اگر یہ پاتا ہے کہ وہ ایک سوچنے والی شے کے  
 سوا کچھ نہیں تو اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ واقعاً بھی ذہن کی حقیقت  
 یا ماہیت صرف سوچنا ہی ہے اور یہ "صرف" کا لفظ تمام ان چیزوں  
 کو نکال دیتا ہے جو روح کی حقیقت میں داخل کی جاسکتی تھیں۔  
 میرا جواب یہ ہے کہ کتاب طریقی میں میرا مقصود ان چیزوں کا  
 واقعاً نکال دینا تھا بھی نہیں، نہ وہاں واقعہ کی بحث تھی بلکہ محض  
 فکر کی حد تک گفتگو تھی۔ یعنی مدعا فقط اتنا تھا کہ سوچنے یا فکر کرنے سے  
 سمجھو اپنی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں محسوس ہوتی، کہ ایک ایسی  
 شے ہوں جو سوچتی ہے یا سوچنے کی قوت رکھتی ہے۔ البتہ اب  
 آگے میں یہ بھی بتاؤں گا کہ نفس ایسی واقعہ سے کہ سمجھو اپنی حقیقت  
 اس کے سوا کچھ نہیں محسوس ہوتی، یہ کیسے لازم آتا ہے کہ وہ اس  
 بھی اسکے سوا کچھ نہیں۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ محض اس لئے کہ میرے اندر مجھ سے  
 ایک کامل تر ذات کا تصور موجود ہے، یہ کیسے لازم آیا کہ واقعاً بھی  
 یہ تصور کامل تر ہے، چہ جائیکہ خود وہ ذات موجود ہو جس کا یہ تصور  
 ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ تصور کے لفظ میں درا پہام ہے کیونکہ  
 اس سے مراد اگر میرے ذہن کا محض ایک فعل ہے، تو ظاہر ہے  
 کہ اس کو مجھ سے کامل تر نہیں کہا جاسکتا، لیکن اگر اس سے مراد  
 وہ شے ہے جس کی ذہن کا یہ فعل نامزدگی کرتا ہے، تو خواہ وہ شے  
 میرے ذہن سے باہر موجود نہ مانی جائے تاہم اپنی ماہیت کے  
 لحاظ سے مجھ سے کامل تر ہو سکتی ہے۔ بہر حال اب اس کتاب  
 میں پوری طرح بتاؤں گا کہ محض اس لئے کہ میرے اندر مجھ سے  
 ایک کامل تر ذات کا تصور موجود ہے، یہ کیسے لازم آتا ہے کہ

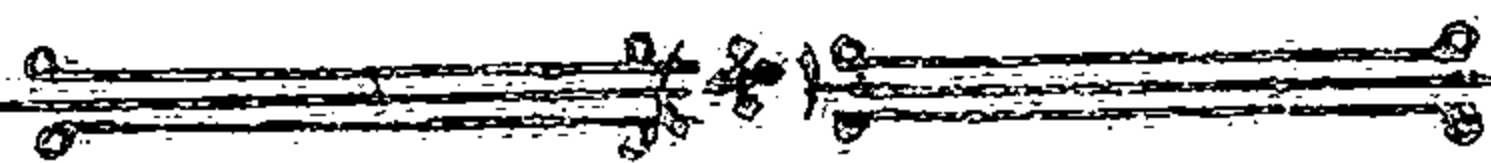
خود یہ ذات بھی فی نفسہ موجود ہے۔

ان دو اعتراضوں کے علاوہ دو تحریریں اور بھی نظر سے گذری ہیں جن میں اس موضوع پر پوری بحث ہے، مگر ان میں میرے مقدمات پر اتنا اعتراض نہیں جتنا نتائج پر ہے اور ان کی بناء ملاحظہ کے پیش یا افتادہ دلائل پر ہے۔ لیکن اس قسم کے دلائل کا چونکہ ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا جو میرے مقدمات کو انہی طرح سمجھ لیں گے اور چونکہ بہت سے لوگ اس قدر ضعیف العقل ہوتے ہیں کہ کسی معاملہ میں جو رائے پہلے ان کے سامنے آجاتی ہے خواہ وہ کیسی ہی غلط و دور از عقل ہو اکثر اسکو قبول کرتے ہیں اور پھر بعد کو مضبوط سے مضبوط دلائل پر مبنی تردید کو بھی نہیں ہانتے لہذا میں یہاں ایسے لوگوں کو جواب دینا نہیں چاہتا، ورنہ در ہے کہ پہلے مجھ کو ان کے سارے اعتراضات بیان کرنا پڑینگے۔ اصولی طور پر صرف اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ انکار خدا کے باب میں ملاحظہ جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ یا تو خدا کو انسان پر قیاس کرنے کی غلطی کا نتیجہ ہوتا ہے یا پھر ہم اپنی عقل کو اتنا اعلیٰ و قوی فرض کر بیٹھتے ہیں کہ خدا جو کچھ کر سکتا ہے یا جو کچھ اس کو کرنا چاہئے اس کو سمجھنے اور فیصلہ صادر کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ لہذا اگر ہم اتنی بات کا خیال رکھیں کہ انسانی ذہن ناقص و محدود اور خدا کامل و نامحدود ہے تو پھر ان ملاحظہ کی باتوں میں ہلکے کوئی اشکال محسوس ہو گا۔

غرض لوگوں کے خیالات کو کافی طور سے جان چکنے کے بعد اب میں خدا اور روح کے مسئلہ کو پھر اٹھاتا ہوں، ساتھ ہی فلسفہ اولی کے اصول و مبادی پر بھی بحث کرونگا۔ لیکن ان مبادی میں عوام سے کسی داد کا طالب نہیں ہوں نہ یہ چاہتا ہوں کہ میری کتاب کو زیادہ آدمی پڑھیں۔ بلکہ میں اس کے پڑھنے کا صرف

ان لوگوں کو مشورہ دیا ہوں، جو سنجیدگی سے خود میرے ساتھ  
تفکر کرنا چاہتے ہیں، اور اپنے ذہن کو حواس سے الگ کر کے  
ہر قسم کے تعصبات سے پاک کر سکتے ہیں، میں ابھی طرح جانتا  
ہوں، کہ ایسے اشخاص کی تعداد بہت کم ہوگی، بالی جو لوگ میری دلیلوں  
کے ربط و ترتیب پر غور کرنا نہیں چاہتے، قالی تنقید و نکتہ چینی کیلئے  
پڑھنا چاہتے ہیں، انکو کچھ زیادہ نفع نہ پہنچے گا۔ یوں عیب نکالنے کے  
مواقع تو ان کو بہت ملیں گے، مگر کسی معقول یا ایسے اعتراض کا  
موقع مشکل ہی سے ملے گا، جو جواب کا مستحق ہو۔ اور چونکہ میں  
ان مباحث میں سب کو مطمئن کرنے کا وعدہ نہیں کرتا، نہ اس کا  
دعویٰ ہے، کہ ہر شخص کے اشکالات کا میں نے اندازہ کر لیا ہے  
اس لئے میری کوشش سب سے پہلی یہ ہوگی کہ اپنے ان  
خیالات کو پیش کردوں، جن کی بدولت میں سمجھتا ہوں، کہ صدائے  
کے قطعی و بدیہی علم تک پہنچا ہوں۔ دیکھنا ہے، کہ جن دلیلوں  
نے مجھ کو اس علم تک پہنچایا ہے، دوسروں کو بھی پہنچائی ہیں  
یا نہیں۔ پھر اس کے بعد میں ان ارباب علم و فکر کا جواب  
دوں گا، جن کی خدمت میں بیچنے سے پہلے رائے کے لئے  
اس کتاب کو بھیجا تھا، اور جنہوں نے کچھ اعتراضات کئے ہیں۔  
ان حضرات نے اتنے مختلف قسم کے اور کثیر اعتراضات کروئے  
ہیں، کہ میں جرأت سے کہہ سکتا ہوں کہ اس مشکل راہ سے کوئی  
ایسا تیار اور معقول اعتراض کیا جاسکتا ہے جو کسی نہ کسی طرح  
ان میں آ نہ گیا ہو۔

لہذا جو لوگ ان تفکرات کو پڑھنا چاہتے ہیں، ان سے  
میری درخواست ہے، کہ جیتک ان تمام اعتراضات اور ان کے  
جوابات کو پڑھ نہ لیں، اس وقت تک کوئی فیصلہ نہ صادر فرمائیں۔





# ذیل کے تفکرات کا

## خلاصہ

سب سے پہلے تفکر میں، تو اُن دلائل کا بیان ہے، جن کی بنیاد پر ہم ہر شے میں شک کر سکتے ہیں خصوصاً مادی اشیا میں اور کم از کم اس وقت تک جب تک کہ علوم کی موجودہ بنیادوں کے سوا دوسری بنیادیں ہلکو نہ ہاتھ آجائیں۔ اتنے وسیع شک کا قائلہ ممکن ہے، کہ اول نظر میں معلوم نہ ہو، تاہم یہ ہے بہت ہی عظیم الشان، کیونکہ اس کی بدولت ہلکو ہر قسم کے تفصیلات سے نجات مل جاتی ہے، اور ذہن کو حواس سے انقطاع کا مادی بنانے کا ایک نہایت آسان راستہ نکل آتا ہے اور بالآخر اس طریقہ سے جن صداقتوں تک ہم پہنچیں گے، ان پر پھر کسی طرح کا مزید شک ناممکن ہو گا۔

دوسرے میں یہ بتایا گیا ہے، کہ ذہن، جب بالکل مخلی بالبطع ہو کر تمام چیزوں کو جن کے وجود میں ذرا بھی شک کا امکان ہے، معدوم فرض کر لیتا ہے، تو اس حالت میں بھی، وہ خود اپنے وجود کا کسی طرح بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ سب بھی نہایت اہم ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ ذہن ان چیزوں میں جو بالذات ذہن یا عقل

تعلق رکھتی ہیں اور ان چیزوں میں جن کا تعلق جسم سے ہے، آسانی سے منہ پر کر سکتا ہے۔ ممکن ہے، کہ کتاب کے اسی حصہ تک پہنچ کر لوگ یقائے روح کا ثبوت بھی تلاش کرنے لگیں، لہذا ان سے یہاں عرض کئے دیتا ہوں کہ کتاب بھر میں شروع سے آخر تک سیری یہ کوشش رہی ہے کہ کوئی بات ایسی نہ لکھوں جو نہایت قطعی براین پر مبنی نہ ہو، اس لئے لازماً میں نے وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو علمائے ہندسہ کرتے ہیں یعنی نتیجہ نکالنے سے پہلے تمام ان مقدمات کو بیان کر دیتا ہوں، جن پر کوئی نتیجہ مبنی ہوتا ہے۔

یقائے روح کو ٹھیک طور پر جاننے کے لئے سب سے مقدم و اصلی شے خود روح کا واضح و صحیح تصور قائم کرنا تھا جو جسم کے تمام تصورات سے ممتاز ہو، اور پہلے میں نے یہی کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ جاننا بھی ضروری تھا کہ جن چیزوں کا ہم واضح و صاف تصور رکھتے ہیں، وہ اسی تصور کے مطابق صحیح بھی ہوتی ہیں اور یہ امر چوتھے تفکر سے پہلے نہیں ثابت کیا جاسکتا تھا۔ مزید برآں حقیقت جسم کا تصور بھی ممتاز طور پر ہونا لازمی ہے جس پر کچھ تو دوسرے تفکر میں بحث ہے، اور کچھ چوتھے اور پانچویں میں سب سے آخر میں، انہیں امور سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ جن چیزوں کو ہم جسم و نفس کی طرح واضح و جلی طور پر مختلف الجوہر تصور کرتے ہیں، وہ واقعاً بھی ایک دوسرے سے مختلف جواہر ہوتے ہیں۔ چوتھے تفکر میں یہی نتیجہ نکالا گیا ہے۔ دوسرے تفکر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جسم کا تصور ہم بغیر اقسام کے نہیں کر سکتے، بخلاف اس کے روح کا تصور ہم غیر منقسم ہی ہونے کی حیثیت سے کر سکتے ہیں، کیونکہ ہم روح کی تقسیم و تنقیف کا اس طرح تصور نہیں کر سکتے جس طرح جسم کے چھوٹے سے چھوٹے ذرہ کے

متعلق بھی ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کا آدھا ہو سکتا ہے، لہذا ماننا پڑتا ہے کہ جسم و روح کی ماہیت ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں، بلکہ متضاد ہے۔ بس رسالہ بتا میں اس بحث کو میں اس سے آگے نہیں لے گیا ہوں، کیونکہ اس نے ہی سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ فساد جسم فساد روح کو مستلزم نہیں ہے، اور اس لئے آدمی موت کے بعد دوسری زندگی کی امید کر سکتا ہے۔ اس لئے بھی اس بحث کو اور آگے نہیں بڑھایا جاسکتا تھا، کہ طبیعیات کے تمام اصول کی تشریح کرنا پڑتی۔ سب سے پہلے تو یہ جاننا ہو گا کہ جو اشیاء یا جواہر بغیر خدا کے پیدا کئے نہیں موجود ہو سکتیں وہ سب کی سب بالطبع ناقابل فساد ہوتی ہیں، اور اس وقت تک معدوم نہیں ہو سکتیں، جب تک خود خدا اپنے فیضان و جود کو ان سے منقطع کر کے، ان کو نیست نہ کر دے، پھر یہ دیکھنا ہو گا کہ چونکہ جسم بھی من حیث جسم ایک جوہر ہی ہے اس لئے یہ بھی نہیں فنا ہوتا۔ البتہ انسانی جسم کی اس حیثیت جسمیہ کے علاوہ ایک اور حیثیت بھی ہے کہ وہ خاص خاص اعضاء و اجزاء کے اجتماع و ترکیب کا نام ہے، بخلاف اس کے روح اس قسم کی کوئی ترکیبی شے نہیں، بلکہ جوہر محض ہے۔ گو روح کے اغراض و احوال بدلتے رہتے ہیں، مثلاً بعض چیزوں کا یہ تصور کرتی ہے۔ بعض کو چاہتی ہے، بعض کو محسوس کرتی ہے وغیرہ وغیرہ، بائیں ہمہ ان تبدیلیوں سے یہ کوئی اور شے نہیں ہو جاتی ہے۔ بخلاف انسانی جسم کے کہ اگر اس کے کسی عضو یا جزو کی صورت بدل جائے تو یہ چیز ہی دوسری ہو جاتا ہے۔ اس معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا جسم تو آسانی سے فنا ہو سکتا ہے لیکن اس کی روح اپنی حقیقت و نوعیت ہی کے لحاظ سے غیر فانی ہے۔

تفکر سوم میں، اپنے نزدیک کافی بسط کے ساتھ میں نے اثبات خدا کے متعلق اپنی خاص دلیل بیان کی ہے لیکن چونکہ اس میں مادی استیاد پر مبنی موازنوں سے کام نہیں لیا گیا، تاکہ جہاں تک ہو سکے پرسننے والوں کے ذہن کو اس سے الگ اور مخلی باطبع رکھا جاسکے، اس لئے شاید بعض چیزیں ذرا ناصاف رہ گئی ہیں، جو میرے خیال میں بعد کو جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کے جوابوں میں پوری طرح صاف ہو گئی ہیں۔ مثلاً ایک چیز یہ تھی کہ کمال مطلق ہستی کا جو تصور ہمارے اندر موجود ہے وہ ہستی اور کمال کی محض نمائندگی سے خود اسے کمال کا حصہ دار کیسے بن گیا، کہ اس کی علت لازماً کوئی کمال مطلق ہستی ہی ہونی چاہیے۔ اس کو میں نے اپنے جوابات میں ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی کل کی مثال دیکر صاف کیا ہے، فرض کرو کہ اس کل کا تصور کسی کاریگر کے ذہن میں ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی علت ہوگی، یعنی یا تو خود اسی کاریگر کے علم ہی نے اس کو اس کے ذہن میں پیدا کیا ہوگا، یا کسی دوسرے کے علم نے جہاں سے اس کاریگر نے اس کو حاصل کیا ہے، لہذا اسی طرح خدا کا جو تصور ہمارے اندر پایا جاتا ہے ناممکن ہے کہ اس کی علت خود خدا ہی نہ ہو۔

تفکر چہارم میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جن چیزوں کا ہم نہایت واضح و علی طور پر تصور کرتے ہیں، وہ صحیح ہوتی ہیں، ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ غلطی کی کیا حقیقت ہوتی ہے۔ پہلے جو صداقتیں بیان کی جا چکی ہیں، ان کی توثیق اور آگے جو بیان ہوگی ان کی بہتر تفہیم دونوں کے لئے اس کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں مجھ کو گنا ہوں، یعنی اخلاقی غلطیوں سے قطعاً بحث نہیں ہے، بلکہ محض ان غلطیوں سے جو حق و باطل

یا صادق و کاذب کے فیصلہ میں واقع ہوتی ہیں، نیز یہاں  
 سمجھو ان چیزوں سے بھی گفتگو نہیں، جن کا تعلق عقیدہ  
 سے یا زندگی کی رہنمائی سے ہے، بلکہ محض ان چیزوں  
 سے جن کا تعلق نظری صداقتوں سے ہے، اور جن  
 کو تمام تر فطرت کی روشنی سے جاننا جاسکتا ہے۔ ہم  
 میں مادہ یا حقیقت جسمیہ کی توحید و تشریح کے علاوہ وجود خدا  
 کا ایک نیا ثبوت پیش کیا گیا ہے اس میں بھی کچھ اشکالات  
 محسوس ہوں گے، لیکن ان کا حل انہیں اعتراضوں کے  
 جوابات میں ملے گا، جو مجھ پر کئے گئے ہیں۔ مزید برآں  
 میں نے یہ بھی دکھلایا ہے کہ ہندسی برائین کی صداقت  
 بھی خدا ہی کے علم پر موقوف ہے۔

سب سے آخری فکر یعنی ششم میں فہم اور تخیل کے  
 فعل میں فرق کیا گیا ہے، اور اس فرق کی پہچان یا نشانیوں  
 بیان کی گئی ہیں۔ اس میں میں نے دکھلایا ہے کہ انسان  
 کی روح جسم سے قطعاً مختلف شے ہے، تاہم دونوں  
 اس طرح ایک دوسرے سے مربوط و وابستہ ہیں کہ گویا  
 ایک ہی شے بن گئی ہیں جو اس سے جو غلطیاں ناشی ہوتی  
 ہیں، ان سب کی تشریح و توضیح اس فکر میں موجود ہے،  
 ساتھ ہی ان سے بچنے کے ذرائع بھی بتا دیے گئے ہیں  
 اس کے بعد میں نے تمام ان دلائل کو بیان کیا ہے، جن  
 سے ہم مادی دنیا کے وجود کو مستنبط کر سکتے ہیں۔ اسلئے  
 نہیں، کہ میں ان دلائل کو مادی دنیا یعنی کائنات اور  
 انسانی اجسام وغیرہ کے اثبات کے لئے بہت کارآمد  
 خیال کرتا ہوں، کیونکہ ان پر کبھی کسی صحیح دماغ کے آدمی  
 نے شک نہیں کیا، بلکہ اس لئے کہ ان پر ذرا زیادہ غور



کرنے سے پہلو، اچھی طرح پتہ چل جاتا ہے کہ یہ نہ تو اتنے قوی ہیں  
 اور نہ واضح جتنے کہ وہ دلائل، جن سے ہکو خدا اور اپنی  
 روح کا علم حاصل ہوتا ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ انسانی علم  
 کے سارے سرمایہ میں سب سے زیادہ قطعی اور بدیہی  
 دلائل وہی ہیں، جو خدا اور روح کے وجود پر قائم ہیں۔  
 اور چونکہ ان تفکرات سہ میں میری اصلی اور واحد غرض  
 اس کا ثابت کرنا تھا، اسلئے اب یہاں میں ان دیگر مسائل  
 کو چھوڑتا ہوں، جن پر اس کتاب میں ضمناً گفتگو آگئی ہے۔



# تفکرات متعلق فلسفہ اولیٰ

جن میں

وجود خدا اور روح و جسم کے مابین فرق کو ثابت کیا گیا ہے

## تفکرات اول

ان چیزوں کا بیان جن میں شک کیا جاسکتا ہے

ایک زمانہ ہوا، جب مجھ کو پیلو پیل یہ خیال آیا تھا کہ جہنم سے میں نے بہت سی ایسی باتوں کو یاد رکھا ہے، جو غلط ہیں، اور ان غلط باتوں پر جن چیزوں کی میں نے بنیاد رکھی وہ بھی لازماً نہایت ہی مشکوک اور غیر یقینی ہیں۔ اسی زمانہ سے میں نے فیصلہ کر لیا تھا، کہ اگر میں علم کی کوئی مضبوط و مستحکم عمارت کھڑی کرنا چاہتا ہوں، تو زندگی میں ایک مرتبہ اس قسم کی تمام باتوں سے اپنے ذہن کو آزاد کر کے بالکل شروع سے چلنا چاہئے۔ لیکن یہ کام چونکہ بہت بڑا تھا، اس لئے میں نے ایسی پختہ عمر تک پہنچنے کا انتظام کیا جس کے بعد میری زندگی میں اس مقصد کی تکمیل کے لئے، اب کوئی اور بہتر و موزوں تو زمانہ نہیں آسکتا۔ اور اب مزید تاخیر نا جائز ہوگی۔

لہذا اس منصوبہ کے مطابق آج جبکہ سیراد مانع ہر قسم کی  
 فکر سے آزاد ہے، مسکرات و تنہائی کا پورا سکون نصیب  
 ہے، اور خوش قسمتی سے اپنے اندر کوئی ہیجان نہیں محسوس  
 کر رہا ہوں، اپنی تمام گزشتہ آرا و خیالات کو خیر باد کہتا  
 ہوں۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری نہیں، کہ میں ان سب  
 کو غلط ثابت کروں، جس میں شاید کبھی بھی کامیابی نہ ہوگی۔  
 البتہ عقل مجھ کو اسی کا مشورہ ضرور دیتی ہے، کہ جو چیزیں  
 صراحتہً غلط ہیں، جس طرح میں ان کو نہیں مانتا۔ اسی طرح،  
 جو چیزیں بالکل غلطی و غیر مستحکم ہیں ان کے قبول کرنے  
 میں بھی محتاط رہنا چاہیئے، اور اگر ان میں شک و شبہ کی  
 کوئی گنجائش نظر آئے تو میں ان کو رد کر سکتا ہوں اور اس کے  
 لئے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ تحقیق بھی لازمی نہیں، جس کا سلسلہ  
 کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ بس بنیادوں کا کھوکھلا  
 کر دینا کافی ہے۔ باقی عمارت خود ہی زمین پر آ جائے گی  
 لہذا پہلے میں ان اصول اور بنیادوں ہی پر حملہ کرتا ہوں،  
 جن پر میری گزشتہ آرا و خیالات کی عمارت کھڑی تھی۔  
 جن چیزوں کو میں آج تک اعلیٰ سے اعلیٰ صداقت  
 و یقین پر مبنی سمجھتا رہا ہوں، وہ یا تو براہ راست خود  
 جو اس سے یا ان کی وساطت سے ماخوذ ہیں، لیکن حواس  
 بعض اوقات دھوکا دیتے ہیں، اس لئے عقلمندی یہ ہے  
 کہ جس شے سے ایک مرتبہ دھوکا کھایا چکے ہوں، اس پر کمال  
 اعتماد کبھی نہ کرنا چاہیئے۔  
 البتہ یہ کہا جاسکتا ہے، کہ حواس اگرچہ زیادہ چھوٹی  
 اور دور کی چیزوں میں، جو اچھی طرح مشاہدہ میں نہیں آتیں،  
 دھوکا کبھی بھی دھوکا دیتے ہیں، تاہم حواسی معلومات کا کثیر

حادثہ ایسا ہے، جس میں شک کرنا کسی طرح بجا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً میں اس وقت یہاں آگ کے پاس سر دی میں لیباوہ پہنے بیٹھا ہوں، اور میرے ہاتھ میں فلاں کاغذ ہے، وغیرہ۔ یا میں اس سے کیسے انکار کر سکتا ہوں، کہ میں جسم رکھتا ہوں اور یہ میرے ہاتھ ہیں، الا آنکہ میں بالکل بالکل ہو گیا ہوں، وماغ میں ابتر ہے چڑھ گئے ہوں اور اتنا مختل ہو گیا ہوں، جتنا ان دیوانوں کا ہوتا ہے، جو ہیں فقیر لیکن اپنے کو بادشاہ سمجھنے لگتے ہیں، پھر رہے ہیں شنگے لیکن یقین یہ رکھتے ہیں، کہ زہر ہفت پہنے ہیں، یا جن کے خیال یہ مسلط ہو جاتا ہے، کہ ان کا جسم مٹی یا شیشہ کا ہے ظاہر ہے کہ میں بھی اگر اسی طرح کی باتیں کروں تو ان سے کم دیوانہ نہ سمجھا جاؤں گا۔

تاہم یہ معلوم ہے، کہ میں انسان ہوں اور انسان ہوتا ہے اور سونے میں خواب بھی دیکھتا ہے ان خوابوں میں بار بار مجھ کو ایسی ہی باتیں محسوس ہوتی ہیں، جیسی کہ بیداری میں ان دیوانوں کو بلکہ ان سے بھی کہی گئی ہے۔ کتنی دفعہ میں نے رات کو خواب میں دیکھا کہ اس جگہ آگ کے پاس کپڑے پہنے بیٹھا ہوں، حالانکہ کپڑے اتارے بیتر میں پڑا سو رہا تھا، بلاشبہ اس وقت مجھ کو معلوم ہو رہا ہے، کہ یہ کاغذ میں خوابیدہ آنکھوں سے نہیں دیکھ رہا ہوں، جس سر کو میں ہلا رہا ہوں، وہ سو نہیں رہا ہے اپنے ہاتھ کو جان بوجھ کر کسی غرض سے پھیلانے ہوئے ہوں اور اس کو محسوس کر رہا ہوں۔ خواب کی باتیں ایسی واضح اور صاف نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں، خواب میں بھی مجھ کو چیزوں کے اسی طرح حقیقی و واقعی ہونے کا باور دھوکا ہوا ہے، اور دونوں میں فرق و امتیاز کے لئے

ہمارے پاس کوئی قطعی علامات نہیں موجود، جس سے منجھکو  
بیحد حیرت ہوتی ہے اور خیال ہوتا ہے، کہ کہیں اب بھی تو  
سوہی نہیں رہا ہوں۔

فرض کرو کہ ہم واقعاً سوہی رہے ہیں، اور یہ تمام  
چیزیں یعنی کھلی ہوئی آنکھیں، ہلتا ہوا سر پھیلے ہوئے ہاتھ،  
محض التباس ہیں، حتیٰ کہ ہمارے ہاتھ بلکہ سارے جسم  
کا سرے سے کوئی حقیقی وجود ہی نہیں۔ تاہم اتنا ضرور  
ماننا پڑے گا، کہ خواب میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ واقعی  
و حقیقی چیزوں کی گویا بالکل تصویریں ہوتی ہیں، جو بغیر کسی اصل  
کے نہیں بنائی جاسکتیں، اور اس لئے ہمارے ہاتھ سر  
جسم وغیرہ یہ عام چیزیں محض خیالی نہیں بلکہ حقیقی و واقعی  
ہیں۔ بل مانس اور بڑ مانس کی سی عجیب الخلق اور

وہمی سے وہی چیزوں کی بھی جب کوئی مصور تصویر بنانا ہے  
تو بالکل کوئی نئی صورت نہیں اختراع کر سکتا، بلکہ مختلف  
حیوانات کے اعضا کو ملا جلا کر محض ایک نئی شکل بنا دیتا ہے۔  
اور اگر فرض وہ کوئی ایسی تصویر بھی بنا دے، جو سرے  
پاؤں تک بے اصل اور خالص وہی ہی ہو تو بھی کم از کم  
جن رنگوں سے یہ بنی ہے، وہ تو اصلی و حقیقی ہی ہونگے۔  
اسی طرح آنکھیں، ہاتھ، سر جسم وغیرہ عام اشیاء لاکھ  
وہمی و خیالی ہیں، تاہم اتنا تو اقرار تسلیم ہی کرنا ہوگا، کہ کچھ اور  
چیزیں ان سے زیادہ بسیط و کلی حقیقتاً ایسی موجود ہیں، جن  
سے دل جل کر وہ تمام واقعی یا خیالی اشیاء بنتی ہیں، جن کو ہم  
اپنے ذہن یا شعور میں پاتے ہیں۔ پس عالم اجسام اور اس  
کے امتداد کی یہی نوعیت سمجھو مثلاً اشیاء کی شکل و صورت  
ان کا قد و قامت ان کی تعداد و مقدار نیز وہ مکان جس میں



یہ پائی جاتی ہیں، اور وہ زمان جو ان کے دوران و بقا کا پیمانہ ہے  
یہ سب چیزیں اسی نوعیت کی ہیں۔  
اس لئے اگر ہم طبعیات، طبیعت، طب وغیرہ تمام ایسے  
علوم کو جو مرکب اجسام سے بحث کرتے ہیں، نہایت مشکوک و  
مشتبہ کہیں تو مقدمات بالا کا یہ شاید غلط نتیجہ نہ ہو گا۔ بخلاف  
حساب و ہندسہ وغیرہ ایسے علوم کے جن کا موضوع سب سے  
کلی اور بسیط ترین اشیا ہوتی ہیں، اور جن کو اس سے بحث نہیں کہ یہ  
اشیا واقعا کائنات فطرت میں موجود ہیں یا نہیں، وہ البتہ کسی قطعی و غیر مشکوک  
امر پر مشتمل ہوتے ہیں مثلاً میں سوؤں یا جاگوں، مگر وہ  
اور تین مل کر ہمیشہ پانچ ہی ہوں گے، اور مربع کے اضلاع چار  
سے زیادہ کبھی نہ ہوں گے، نہ یہ ممکن معلوم ہوتا ہے، کہ ایسی واضح و بدیہی  
صدائقوں کے اندر کسی شک و شبہ یا کذب کی گنجائش کھل سکے۔  
تاہم ایک بات کا یقین میرے ذہن میں مدت سے چلا آتا  
ہے کہ خدا موجود ہے، جو سب کچھ کر سکتا ہے، اور جس نے  
مجھ کو، جیسا کہ میں ہوں، بنایا اور پیدا کیا ہے۔ لہذا کیا یہ ممکن  
نہیں کہ وہ اصل نہ زمین کا وجود ہو نہ آسمان کا، نہ جسم کا، نہ شکل  
و صورت کا نہ قد و قامت کا اور نہ زمان و مکان کا پھر بھی اس  
نے مجھ کو ایسا بنا دیا ہو، کہ یہ سب چیزیں اسی طرح محسوس ہوتی ہوں  
کہ گویا واقعا موجود ہیں اور میں کیسے جان سکتا ہوں کہ خدا نے  
ایسا نہیں کیا ہے؟ اور جس طرح دو نوروں کو بعض اوقات کسی  
امر کے مشعلق میں غلطی یا دھوکے میں مبتلا سمجھتا ہوں، حالانکہ وہ  
خود اپنے نزدیک اس کا قطعی و یقین علم رکھتے ہیں، کیا اسی طرح  
یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا نے مجھ کو ایسا بنا دیا ہو، کہ جب میں  
دو اور تین کو جمع کرتا یا کسی مربع کے اضلاع کو گنتا، یا اس سے  
بھی کوئی آسان تر حکم لگاتا ہوں، درہم طیکہ اس سے آسان تر کوئی

حاکم ممکن بھی ہو، تو ہمیشہ دھوکے میں مبتلا ہو جاتا ہوں؟ لیکن خدا  
خالق اس طرح ٹھیکو دھوکے میں رکھنا پسند نہ کرتا، کیونکہ اس کو  
بہت ہی رحیم و کریم کہا جاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر اس کا  
رغم و کرم اس کو نہیں پسند کر سکتا، کہ میں ہمیشہ دھوکا کھاتا رہوں  
تو یہ بھی اس کی شان رحیمی کے منافی ہوگا، کہ کبھی میں دھوکے  
میں مبتلا ہو سکوں، حالانکہ اس میں شک نہیں ہو سکتا، کہ کبھی کبھی  
تو مبتلا ہوتا ہی رہتا ہوں۔

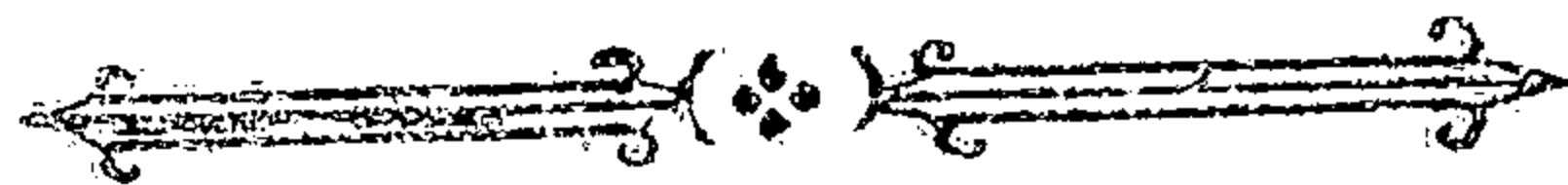
بعض لوگ تو اس طرح تمام چیزوں کو غیر یقینی سمجھنے کے  
بجائے، شاید اتنی قدرت والے خدا ہی کا انکار کر دیں گے۔  
سردست ہم کو ان کی تردید کی ضرورت نہیں، اور ان کی خاطر  
میں ہم فرض کئے لیتے ہیں، کہ خدا کے متعلق اوپر جو کچھ کہا گیا،  
محض فساد ہے۔ بایں ہمہ میں اپنے وجود کی اس حالت  
تک جس طرح پہنچا ہوں، اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو آخر  
ہو ہی گی؟ خواہ وہ اس کو نجات و اتفاق کا نتیجہ قرار دیں،  
خواہ اسے اس کے باہمی ربط و تسلسل کا، خواہ کسی اور شے کا،  
لیکن چونکہ دھوکا کھانا یا غلطی کرنا ایک نقص ہے اس لئے  
اتنا بہر حال یقینی ہے، کہ میرے وجود کی علت حقیقی نہ یا وہ  
ناقص قدرت ہوگی اسی نسبت سے میرا ہمیشہ دھوکا کھانے  
رہنا اغلب ہوگا۔ ان دلائل کا میرے پاس کوئی قطعی جواب  
نہیں البتہ اتنا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں، کہ جن چیزوں کو  
میں ایک زمانہ میں یقینی و مسلح جانتا تھا، ان میں سے  
ایک بھی ایسی نہیں، جس پر کسی نہ کسی طرح میں شک نہ کر سکتا  
ہوں، اور یہ شک محض سطحی نہیں، بلکہ نہایت قوی دلائل پر  
بنی ہے۔ لہذا اگر میں علوم میں کسی قطعی و یقینی شے کو پانا چاہتا  
ہوں تو ان مشتبہ چیزوں کے یقین سے مجھے اتنا ہی بچنا چاہیے

جتنا ان چیزوں کے یقین سے جو صراحتہ غلط ہوتی ہیں۔  
 لیکن صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ اس کو پوری طرح یاد  
 رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ پرانے خیالات عادت و مانوسیت کی  
 بنا پر بار بار میرے ذہن میں نمود کرتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ مزاحمت  
 کے باوجود بھی اکثر آجاتے اور مجھ کو مغلوب کر لیتے ہیں۔ کوطن  
 غالب ہی ہے، کہ یہ خیالات درحقیقت صحیح ہیں، اور شک  
 کا صرف فی الجملہ ہی امکان ہے، تاہم جب تک جان بوجھ کر میں ان کا  
 بالکل انکار نہ کروں گا، میری یہ مغلوبیت دور نہ ہوگی، نہ میرے  
 پرانے اور نئے تعصبات میں ایسا توازن پیدا ہوگا جو کسی ایک  
 طرف زیادہ جھک جانے سے بچا سکے۔ میں چاہتا ہوں کہ اندر  
 سے میری رائے میری عادتوں سے اس طرح مغلوب نہ ہو جائے کہ اس کو  
 صداقت کی صراط مستقیم سے ہٹا سکے۔ میری دست اس طریقہ میں  
 کسی خطا و خطرہ کا بھی احتمال نہیں، کیونکہ یہ محض ایک علمی نظری

سوال ہے، عمل سے اس کا تعلق نہیں۔  
 لہذا میں فرض کئے لیتا ہوں، کہ خدا نہیں، بلکہ کوئی خبیث  
 روح یا شیطان ہے، جو انتہائی حد تک قاور ہونے کے ساتھ اعلیٰ  
 درجہ کا مکار بھی ہے، وہ اپنی تمام کارستانیوں سے مجھ کو دھوکا دیرہا  
 ہے۔ میں ماننے لیتا ہوں کہ زمین و آسمان، ہوا رنگ، آواز، شکل  
 و صورت تمام خارجی چیزیں محض اغاثات احلام ہیں، جن کا جال اسی  
 شیطان نے مجھ کو فریب دینے کے لئے بچھا رکھا ہے، مجھ کو تسلیم ہے  
 کہ نہ میرے ہاتھ ہیں نہ آنکھیں، نہ گوشت، نہ خون، نہ حواس، بلکہ میں  
 نے محض غلط طور پر ان تمام چیزوں کا یقین کر رکھا ہے۔ میں  
 اسی خیال پر ضد کے ساتھ قائم رہوں گا، اور اگر اس ذریعہ سے  
 کسی صداقت تک پہنچا میرے بس میں نہ ہوا تو بھی کم سے کم  
 اپنے کو توقف میں رکھ کر غلط باتوں کے باور کرنے سے تو

بچ سکوں گا، اور اس شیطان کا کرو فریب، خواہ وہ کتنا ہی زبردست ہو، مجھ پر ساط نہ ہو سکے گا۔

لیکن یہ کام ہے ذرا محنت طلب اور سخت، اس لئے آرام پسند طبیعت نادر کشتہ پرانی ہی راہ کی طرف تھسٹینا چاہتی ہے۔ جس طرح ایک قیدی، جو سو رہا ہے، اور خواب میں آزادی کے مزے لے رہا ہے، جہاں ذرا نیند سے چوٹکتا، اور اس آزادی کے محض خواب ہوئے کچھ خیال آتا ہے، تو بیدار ہونے سے ڈر جاتا ہے، اور اس خوشگوار خواب ہی میں بڑا رہنا چاہتا ہے۔ یہی میرا حال ہے، کہ ذہن نامحسوس طور پر پرانے خیالات کی طرف عود کر رہا ہے، وہ ڈرتا ہے، کہ جاگنے کے بعد یہ رہا ہے۔ خواب کا سکون بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے، اور صد اقامت کی روشنی ملنے کی جگہ ایسا نہ ہو کہ دشواریوں کی جوتاری کی پیدا ہو گئی ہے، وہی رفع نہ ہو سکے۔



## تفکر و دم

انسانی ذہن کی حقیقت اور جسم کی نسبت اسکا آسانی جان سکتا



کل کے تفکر نے میرے ذہن کو شکوک سے اس قدر بھر دیا ہے، کہ اب ان کا بھولنا میری طاقت سے باہر ہو گیا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو کیسے رفع کر سکوں گا۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اتنے گہرے پانی میں دفعتاً گر گیا ہوں کہ نہ اس کی تہ میں پاؤں جم سکتے ہیں اور نہ اس کی سطح پر تیرنا ممکن ہے تاہم ایک کوشش تو کرتا ہوں اور وہی کل والے راستہ سے، یعنی تمام ان چیزوں کو جن میں ذرا بھی شک کی گنجائش ہے، قطعاً غلط سمجھ کر ذہن سے نکالے دیتا ہوں، اور اس وقت تک اسی پر قائم رہوں گا، جب تک کوئی یقینی بات ہاتھ نہ آجائے یا کم از کم یہی معلوم ہو جائے، کہ دنیا میں کوئی بات بھی یقینی نہیں۔ ارسطو سے کہہ کر ارض کے پھٹنے کے لئے صرف ایسی ہی ضرورت تھی کہ کوئی ایک مضبوط و قائم نقطہ مل جائے۔ اسی طرح مجھ کو بھی خوش قسمتی سے اگر صرف کوئی ایک قطعی و غیر مشکوک



شے مل جائے، تو پھر بجا طور سے بڑی بڑی اسیدیں قائم کر سکتا ہوں۔

لہذا میں ماننے لیتا ہوں، کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں سب غلط ہے، میرے حلقہ میں جتنی باتیں ہیں سب کی سب محض خواب ہیں، جن کا بھی کوئی وجود نہ تھا۔ میں فرض کئے لیتا ہوں کہ میرے پاس کوئی حاست تک نہیں، جسم، شکل، صورت، امتداد حرکت زمان مکان تمام چیزیں خالی من گھڑت کہانیاں ہیں۔ اب کوئی بات یقین کی جاسکتی ہے؟ غالباً صرف یہی کہ کوئی بات یقینی نہیں۔

لیکن میں نے یہ کیسے جانا، کہ ان چیزوں کے علاوہ بھی کوئی اور ایسی شے نہیں ہے جس میں شبہ کی گنجائش نہ ہو؟ کیا خدایا اور کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو ان خیالات کو میرے ذہن میں ڈالتی ہے؟ ضروری نہیں، ممکن ہے کہ میں خود ہی ان خیالات کو اپنے اندر پیدا کر دینے کی قابلیت رکھتا ہوں۔ تو پھر کیا میں خود کم از کم کوئی شے نہیں ہوں؟ لیکن ابھی اوپر ہی میں اپنے جسم اور حواس سے انکار کر چکا ہوں، پھر بھی مجھ کو یہ قبول کرنے میں تامل ہے، کہ میرا وجود، جسم اور حواس پر اتنا موقوف ہے، کہ بغیر ان کے میں باہر نہیں جاسکتا؟ لیکن میں نے تو اپنے کو یہ تک ماننے پر آمادہ کر لیا تھا، کہ دنیا بھر میں سرے سے کچھ ہے ہی نہیں، نہ زمین ہے نہ آسمان نہ روح ہے، نہ جسم، لہذا کیا اسی سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا تھا، کہ میں خود بھی نہیں ہوں؟ نہیں، بلکہ اسی سے تو اسے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ اگر میں نے اپنے کو کسی بات پر آمادہ کیا، یا کسی شے کا بھی خیال کیا، تو میرا وجود قطعاً تھا، جس میں شک کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔ مگر فرض کرو کہ ایک نامعلوم ہستی مجھ کو دھوکا دے رہی ہے، جو نہایت طاقت ور اور نہایت چالاک ہے، اور اپنی ساری طاقت مجھ کو

برابر دھوکا دینے میں صرف کرتی رہتی ہے اگر میں دھوکا کھا رہا ہوں  
تو اس سے بھی یہی غیر مشکوک نتیجہ نکلتا ہے کہ میں ہوں جہاں تک  
دھوکا دے سکتی ہو، جی کھول کر دینے دو، جب تک مجھ کو کسی بات  
کا جی شعور ہے، وہ کسی طرح یہ دھوکا نہیں دے سکتی کہ میں خود کچھ  
نہیں ہوں۔ لہذا جتنی دفعہ بھی میں اپنے دل میں اس کا خیال کرتا  
ہوں کہ میں ہوں، میں موجود ہوں، یہ نتیجہ بہر حال غیر مشتبہ طور پر نکلتا ہے  
کہ میں کچھ نہ کچھ ہوں۔

البتہ ابھی یہ صاف طور پر یہ نہیں چلتا کہ کیا ہوں؟ ہوں  
تو یقیناً۔ لہذا اب آگے اس سے خبردار رہنا چاہئے کہ غلطی سے اپنے  
کو کوئی ایسی شے نہ سمجھ بیٹھوں، جو نہیں ہوں تاکہ تمام چیزوں میں سب  
سے زیادہ اپنے وجود کا جو قطعی و یقینی علم حاصل ہو گیا ہے، اس  
میں کوئی لغزش ہونے پائے۔

لہذا سب سے پہلے میں از سر نو اس پر غور کروں گا، کہ ان  
موجودہ خیالات سے پہلے میں اپنے کو کیا سمجھتا تھا، اور اپنے  
پر ان خیالات میں سے تمام ایسی باتوں کو قطعاً چھوڑ دوں گا،  
جن میں ذرا بھی شک کی گنجائش ہو، تاکہ صرف اور صرف وہی شے  
باقی رہ جائے، جو تمام و کمال یقینی اور غیر مشکوک ہو۔ اچھا تو  
اب میں دیکھتا ہوں، کہ اب تک میں نے اپنے کو کیا سمجھا تھا  
ظاہر ہے، کہ آدمی سمجھتا تھا لیکن آدمی کیا ہے؟ کیا اس کا جواب یہ ہے کہ آدمی  
حیوانِ ناطق ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، کیونکہ پھر یہ سوال ہوگا، کہ اچھا  
حیوان کیا ہے ناطق کیا ہے، اور اسی طرح ایک سوال سے نادانستہ  
نامتناہی سوالات پیدا ہو جائیں گے، جو پہلے سے زیادہ مشکل  
و پیچیدہ ہوں گے، اور میرے پاس اتنا وقت بالکل نہیں  
کہ اس قسم کی دشواریوں کو بڑھاتا چلا جاؤں۔ میں یہاں صرف ان  
خیالات کو لوں گا جو خود بخود میرے ذہن میں آتے ہیں، اور

جو اپنے وجود پر غور کرتے وقت فطرۃ پیدا ہونے میں حیرت میں پہلے سمجھتا تھا، کہ لپٹھ پائوں، گوشت پوست ہڈیوں وغیرہ کا ایک ڈھانچہ ہوں، جیسے کہ ایک مردہ ہوتا ہے اور اس ڈھانچے کو "جسم" کہتا تھا۔ نیز یہ بھی سمجھتا تھا کہ کھاتا ہوں، چلتا ہوں، سوچتا ہوں، محسوس کرتا ہوں، اور ان کو میں روح کے افعال جانتا تھا، لیکن اس پر میں نے توجہ نہیں کی کہ روح کیا ہے، یا اگر کی بھی تو بس ہوا، تاثیر، شعلہ وغیرہ کی سی کوئی نہایت ہی تادر و لطیف شے قرار دیا، جو میرے سارے اجزائے جسم میں جاری و ساری ہے۔ باقی خود جسم کیا ہے، اس کی حقیقت کی نسبت مجھ کو کوئی شک ہی نہیں ہوا کیونکہ ایک بدیہی شے تھی، اور اگر اس زمانے کے خیالات کے مطابق اس کی تعبیر کرتا تو یوں کہتا کہ جسم سے میری مراد ایسی شے ہے جو محدود و مشکل ہو، جو کسی جگہ یا مکان میں ہو اور اس مکان کو اس طرح شاغل ہو، کہ کوئی دوسرا جسم بوقت واحد اس میں نہ آسکے، نیز جو دیکھنے، سننے، سونچنے، چکھنے، یا چھونے سے محسوس ہو سکتا ہو، جو اپنے اندر سے نہیں، بلکہ باہر کے کسی محرک کے اثر سے مختلف جہات میں حرکت کر سکتا ہو، کیونکہ حرکت، احساس یا فکر کی قوت کو میں خود جسم کی حقیقت نہیں سمجھتا، بلکہ جسم میں ان قوتوں کو دیکھ کر تو اسے اپنے ساتھ ہوتا تھا۔

لیکن جب میں نے یہ فرض کر لیا، کہ ممکن ہے، کوئی ایسی نہایت طاقتور بستی موجود ہو، جو ساتھ ہی نہایت خمیشتہ و چالاک بھی ہو، اور جو مجھ کو اپنی پوری طاقت و شرارت سے برابر دھوکا دیتی رہتی ہو، تو پھر سوال ہوتا ہے، کہ آخر میں کیا ہوں؟ کیا ایسی صورت میں اوپر جسم کے جو متعلقات میں نے بیان کئے ہیں، ان میں سے کسی ایک شے کی نسبت بھی قطعیت کے ساتھ دعویٰ کر سکتا ہوں، کہ وہ میں ہوں؟ خالی الذہن ہو کر دیکھتا ہوں، تو ان

میں ایک چیز بھی ایسی نہیں پاتا جس کو اپنی ذات کی طرف منسوب  
 کر سکوں، لہذا ان کو گناہ کی ضرورت نہیں۔ اب روح کی صفات  
 اوپر جو بتایا ہوں دیکھو ان میں سے کوئی ایسی شے ہے جو میری  
 ذات میں داخل ہو۔ ان میں سب سے پہلی صفات کھانے پینے  
 اور چلنے پھرنے کی ہیں، لیکن اگر یہ سچ ہے، کہ میں جسم نہیں رکھتا،  
 تو پھر یہ بھی سچ ہے کہ نہ میں چل سکتا ہوں اور نہ کھا سکتا ہوں، ایک اور صفت  
 احساس کی تھی، لیکن جسم کے بغیر ہم محسوس بھی نہیں کر سکتے علاوہ  
 ہیں خواب میں یا رہا میں نے بہت سی چیزوں کو محسوس کیا، لیکن  
 چاہئے کہ یہ معلوم ہوا، کہ واقعا ایک تھی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ روح  
 کی ایک اور صفت فکر یا خیال قرار دی تھی، یہ البتہ ایسی شے ہے،  
 جو میری ذات میں داخل ہے، اور صرف یہی ایسی شے ہے، جو مجھ سے  
 کسی طرح بھی منفک نہیں ہو سکتی۔ میں ہوں میں موجود ہوں، یہ بالکل یقینی ہے  
 مگر جب تک، اسی وقت تک جب تک میں سوچتا یا خیال کرتا ہوں، کیونکہ اگر میرا  
 خیال کرنا کلیتہً باطل ہو جائے، تو پھر میرا ہونا بھی غائب ہو جائے گا  
 چونکہ میں کسی ایسی شے کو قبول نہیں کرتا، جو بالکل ناقابلِ انکار اور  
 لازمی طور پر صحیح نہ ہو، لہذا میں صرف ایک ایسی چیز ہوں جو خیال  
 کرتی ہے، یعنی ذہن، نفس، فہم یا عقل۔ ان الفاظ کا ٹھیک  
 مفہوم پہلے میرے لئے نامعلوم تھا۔ غرض اب میں ایک حقیقی اور  
 موجود چیز ہوں، لیکن کیا چیز؟ وہی جو خیال کرتی ہے۔ اس کے  
 علاوہ کچھ اور بھی ہوں ہر اپنے تخیل پر پورا زور ڈال کر دیکھوں گا،  
 کہ آیا اس کے علاوہ میں کچھ اور بھی ہوں۔ یقیناً میں ان اعضاء کا  
 مجموعہ نہیں ہوں، جن کو انسانی جسم کہا جاتا ہے میں وہ ناقد اشیر  
 بھی نہیں ہوں، جو ان تمام اعضاء میں لازمی سمجھا جاتا ہے۔ نہ میں ہوا،  
 سانس یا بخار وغیرہ کی کسی کوئی قابلِ تخیل شے ہوں، کیونکہ ان سب کو  
 میں معدوم غرض کہ چکا ہوں، اور اس فرض کو بدلنے بغیر میں پاتا ہوں

کہ میرا وجود بہر حال یقینی و قطعی ہے۔

لیکن جن چیزوں کو میں نے تا موجود فرض کیا ہے، چونکہ ان کو میں جانتا نہیں، اس لئے غالباً وہ خود میری ذات سے جس کو میں جانتا ہوں مختلف نہیں ہیں؟ ابھی اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہتا۔ مجھ کو ابھی صرف ان چیزوں سے گفتگو ہے، جن کو جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں، کہ میں ہوں، اور یہ جانتا چاہتا ہوں، کہ کیا ہوں۔ ظاہر ہے، کہ میرے اس ہونے کا علم ان چیزوں پر قطعاً موقوف نہیں، جن کے وجود کا ابتک مجھ کو علم نہیں، لہذا لازماً یہ کسی ایسی شے پر موقوف نہیں، جس کو میرا تخیل گڑھ سکتا ہے۔ خود تخیل اور گڑھ صئے کے الفاظ ہی سے مغالطہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ میں گڑھ در حقیقت اسی وقت سکتا ہوں، جب مجھ کو خود اپنے کچھ ہونے کا تخیل ہو، اس لئے کہ تخیل یا تصور کے معنی کسی مادی شے کی شکل یا صورت کو ذہن میں لانے کے ہیں۔ اب یہ تو جیسا کہ معلوم ہو چکا، قطعی و یقینی ہے، کہ میں ہوں، ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ باقی تمام تصورات یا اشیاء جن کا تعلق حقیقت جسمیہ سے ہے، محض خواب یا وہم ہوں۔ لہذا معلوم ہوا کہ تخیل یا تصور سے اسلئے کام لینا کہ زیادہ صحیح طور پر یہ جانا جاسکے کہ میں کیا ہوں، ایسی ہی عقلمندی ہوگی، جیسے یہ کہوں، کہ میں جاگ رہا ہوں، اور کسی صحیح و تحقیقی چیز کا ادراک کر رہا ہوں، لیکن چونکہ کافی وضاحت کے ساتھ اس کا ادراک نہیں ہو رہا ہے، اسلئے میں ذرا سوچتا ہوں، تاکہ خواب میں زیادہ صحت و وضاحت سے اس کو محسوس کر سکوں۔ خلاصہ یہ کہ جن چیزوں کا بھی تخیل کے ذریعہ سے علم حاصل کیا جاسکتا ہے، ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں، جو اس علم سے تعلق رکھتی ہو، جو مجھ کو خود اپنی ذات کا حاصل ہے، اور ضرورت اس کی ہے، کہ ذہن کو اس طریق فکر سے ہٹایا جائے، تاکہ یہ خود اپنی



حقیقت کو زیادہ واضح طور سے جان سکے۔  
 اچھا خیر تو اب میں کیا ہوں؟ اس سوال کا جواب اب یہ دیا گیا ہے  
 کہ میں ایک ایسی شے ہوں جو خیال کرتی ہے۔ وہ کیا شے ہے؟ جو خیال  
 کرتی ہے؟ وہ ایک ایسی شے ہے جو شک کرتی ہے، جو سمجھتی  
 ہے، جو جھٹی ہو دعویٰ کرتی ہے، انکار کرتی ہے، چاہتی ہے، نہیں چاہتی ہے،  
 اور وہ احساس و ادراک بھی کرتی ہے۔ یقیناً اگر یہ تمام چیزیں  
 میری حقیقت سے تعلق رکھتی ہیں، تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے  
 اور کیوں نہیں رکھتی ہیں؟ کیا میں وہ نہیں ہوں، جو اس وقت  
 قریب قریب ہر شے میں شک کر رہا ہے، ساتھ ہی وہ کچھ چیزوں  
 کو سمجھ بوجھ بھی رہا ہے، وہ دعویٰ کر رہا ہے، کہ صرف یہی صحیح ہیں  
 اور باقی کا انکار کر رہا ہے، وہ ان کے متعلق اور زیادہ جاننا  
 چاہتا ہے، وہ دھوکا کھانا نہیں چاہتا، وہ بہت سی چیزوں  
 کا تصور کرتا ہے، اور بار بار اپنی مرضی کے خلاف، وہ ہتھیری  
 چیزوں کو محسوس بھی کرتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ گویا  
 آلات حس کی وساطت سے ہے کیا ان میں سے کوئی شے بھی اسی  
 طرح یقینی نہیں جس طرح یقینی ہے کہ میں ہوں اور موجود ہوں، خواہ میں ہمیشہ  
 سوتا ہی رہا ہوں، اور جس ذات نے مجھ کو وجود بخشا ہے، وہ  
 برابر دھوکا ہی دے رہی ہو؟ کیا ان میں سے کوئی شے بھی ایسی  
 ہے، جسکو میرے خیال سے ممتاز یا میری ہستی سے منفک کہہ  
 جاسکتا ہو؟ کیونکہ یہ حقیقت کہ میں شک کرتا ہوں، میں سمجھتا  
 ہوں اور میں چاہتا ہوں، اس درجہ بدیہی ہے، کہ اس کی توجیہ کیلئے  
 اور کسی اضافہ کی مطلق ضرورت نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بالکل عیاں  
 ہے، کہ میں تصور و تخیل کی قوت رکھتا ہوں، گویا ہو سکتا ہے جیسا  
 کہ میں نے اوپر فرض کیا ہے، کہ جن چیزوں کا تصور کر رہا ہوں،  
 وہ صحیح نہ ہوں لیکن تصور کی نفس قوت کا میرے اندر ہونا اور میرے

خیال کا ایک جز ہونا، تو بہر حال یقینی ہے۔ خلاصہ یہ کہ میں وہی  
 شے ہوں جو محسوس کرتی ہے، یعنی جو خاص خاص چیزوں کا ایسا  
 معلوم ہوتا ہے، کہ جو اس کے ذریعہ ادراک کرتی ہے، کیونکہ یہ قطعی  
 ہے کہ میں روشنی دیکھتا ہوں، آواز سنتا ہوں، اور گرمی محسوس کرتا ہوں۔ البتہ  
 یہ کہا جاسکتا ہے، کہ یہ تمام احساسات کاذب ہیں اور میں سو رہا ہوں  
 پھر بھی اتنا یقینی اور بالکل یقینی ہے، کہ مجھکو ایسا معلوم ہوتا ہے  
 کہ روشنی دیکھ رہا ہوں، آواز سن رہا ہوں، اور گرمی محسوس  
 کر رہا ہوں، ایسا معلوم ہونا کسی طرح کاذب نہیں ہو سکتا اور یہی صحیح  
 معنی میں میرے اندر کی وہ چیز ہے، جسکو احساس کہا جاتا ہے،  
 جو ظاہر ہے، کہ ایک طرح کا خیال ہی ہے۔ اس طریقہ سے اب  
 میں پہلے کی بہ نسبت ذرا زیادہ وضاحت و صفائی کے ساتھ یہ جاننے  
 لگا ہوں، کہ میں کیا ہوں۔

باایں ہمہ یہ یقین کرنے سے اب بھی طبیعت باز نہیں آرہی  
 ہے، کہ مادی و جسمانی اشیا، جن کے تصورات ذہن قائم کرتا ہے،  
 جو حواس میں آتی ہیں، اور جن کی خود حواس ہی جانچ بھی کر لیتیں،  
 ان کا علم میری ذات سے جو حواس و تصور میں نہیں آتی، بہت  
 زیادہ واضح ہے۔ گو یہ کہنا درحقیقت بہت ہی عجیب ہے، کہ  
 جن چیزوں کا وجود مجھکو مشکوک معلوم ہوتا ہے، جو میرے لئے  
 نامعلوم ہیں، اور جو مجھ سے تعلق نہیں رکھتیں، ان کو میں بہ نسبت  
 ایسی چیزوں کے زیادہ وضاحت کے ساتھ جانتا اور سمجھتا ہوں،  
 جن کی صداقت کا یقین ہے، جو معلوم ہیں جن کا تعلق خود میری  
 ذات سے ہے، اور جو ایک لفظ میں یوں کہوں کہ میں خود ہوں۔ بات  
 یہ ہے، کہ میرے ذہن کی حیثیت ایک آوارہ گرد کی ہے، جو مارا مارا  
 پھرنا پسند کرتا ہے اور جو اب تک پوری طرح صداقت کی گرفت میں  
 نہیں آ رہا ہے۔ اس لئے ایک مرتبہ اس کی لگام کو اور چھوڑ دو

اور پوری آزادی دیکر ان چیزوں پر غور کرنے دو، جو اس کو اپنے سے  
باہر نظر آتی ہیں، تاکہ اس کے بعد جب ہم سہولت و معقولیت کے ساتھ  
اس کو پھر لگام لگانا چاہیں اور خود اپنی ذات کے اندر غور کرنے کے  
لیئے اس کو ٹھہرانا چاہیں، تو زیادہ آسانی سے ہمارے قابو اور  
رہنمائی کو قبول کرنے۔

لہذا اب ہم ان چیزوں پر غور کرتے ہیں، جن کا علم عوام الناس  
کے نزدیک سب سے زیادہ سہل اور واضح سمجھا جاتا ہے، یعنی اجسام  
جن کو ہم چھوئے اور دیکھتے ہیں، لیکن عام اور کلی اجسام بھی نہیں،  
کیونکہ کلیات میں بالعموم ابہام و التباس و راز زیادہ ہوتا ہے، بلکہ  
کسی ایک خاص جزئی جسم کو لو۔ مثلاً موم کا یہ ٹکڑا جو ابھی تازہ تازہ  
چھتے سے نکال کر لایا گیا ہے، اس سے ابھی شہد کی نرمی رائل  
نہیں ہوئی ہے، اس میں ابھی تک پھولوں کی خوشبو بھی کچھ  
نہ کچھ باقی ہے، اسکا رنگ، شکل اور جسامت تو ظاہر ہی ہے  
یہ سخت ہے، یہ رو ہے صورت پذیر ہے اور اگر اس پر تم ضرب  
لگاؤ تو ایک آواز بھی پیدا ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ جن باتوں کو جسم کی  
علامات خیال کیا جاتا ہے وہ سب اس میں موجود ہیں۔

لیکن جب تک ہم باتیں کر رہے، ذرا اس کو آگ پر تو  
رکھ دو، اب نہ اس کا وہ مزہ باقی رہتا ہے نہ وہ خوشبو، اس کا  
رنگ بدل جاتا ہے اس کی شکل غائب ہو جاتی ہے اس کا حجم  
بڑھ جاتا ہے یہ رقیق ہو جاتا ہے، گرم ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ شکل  
سے ہم اس کو ہاتھ لگا سکتے ہیں، اور ضرب لگانے پر کوئی آواز  
بھی نہیں پیدا ہوتی۔ کیا اس تبدیلی کے بعد بھی وہی موم باقی ہے؟  
ہم کو ماننا پڑتا ہے، کہ ہاں وہی باقی ہے کوئی شخص بھی اس میں  
شک نہیں کرتا اور نہ اس کے خلاف کہتا ہے۔ اچھا تو وہ کیا  
شے ہے، جس کو ہم اس قدر واضح اور غیر مشکوک طور پر موم میں

موجود پاتے ہیں جس کی بنا پر یہ وہی موم باقی رہتا ہے۔ ظاہر  
 ہے کہ یہ ہمارے محسوسات میں کی تو کوئی شے ہو نہیں سکتی، کیونکہ  
 سامعہ، باصرہ، ذائقہ، لامسہ اور شامہ سے جن چیزوں کو جانتا تھا  
 وہ تو سب کی سب بدل گئی ہیں پھر بھی موم وہی موم باقی ہے۔  
 غالباً اب میں سمجھا کہ یہ کیا تھا، یعنی یہ موم نہ تو شہد کی ٹھکان  
 کا نام تھا، نہ پھولوں کی خوشبو کا، نہ رنگ کی سفیدی کا، نہ گل کا آواز  
 کا، بلکہ محض ایک جسم تھا، جو کچھ دیر پہلے جھکو ان صورتوں کے  
 اندر محسوس ہو رہا تھا، اور اب وہ دوسری صورتوں کے اندر  
 اپنا احساس گزار رہا ہے۔ لیکن ابھی ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم  
 ہوا کہ جسم کے اس تصور میں کیا کیا شامل ہے؟ توجہ سے دیکھو  
 کہ جن چیزوں کا تعلق موم سے نہیں ہے، ان کو نکال دینے  
 کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب بجز ایک محض  
 ملائم اور متغیر شے کے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ ملائم، جو متغیر سے  
 کیا مراد ہے؟ کیا اس سے یہ مراد نہیں ہے، کہ موم جو اس وقت  
 گول ہے، مربع ہو جاسکتا ہے، اور مربع سے پھر مثلث کی  
 شکل میں متغیر ہو جاسکتا ہے؟ نہیں یہ مراد ہرگز نہیں، کیونکہ  
 اس قسم کے تو نامتناہی تغیرات کو یہ قبول کر سکتا ہے، اور  
 اسی نامتناہیت کا احاطہ میرا تصور کسی طرح نہیں کر سکتا، لہذا  
 معلوم ہوا، کہ موم کا یہ مفہوم میری قوت تصور کا پیدا کیا ہوا  
 نہیں ہے۔ اسی طرح بتاؤ کہ امتداد سے کیا مراد ہے؟ کیا  
 یہ بھی نامعلوم نہیں ہے؟ کیونکہ جب موم پکھلتا ہے، تو اسکا  
 امتداد زیادہ ہو جاتا ہے، جب ابلتا ہے تو اور زیادہ  
 ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ جس قدر حرارت بڑھتی جاتی ہے، یہ بھی  
 زیادہ ہوتا جاتا ہے، اور اگر موم کے اس شکرے کے متعلق  
 یہ نہ سمجھ لوں کہ یہ امتداد کی اُس سے بہت زیادہ صورتیں

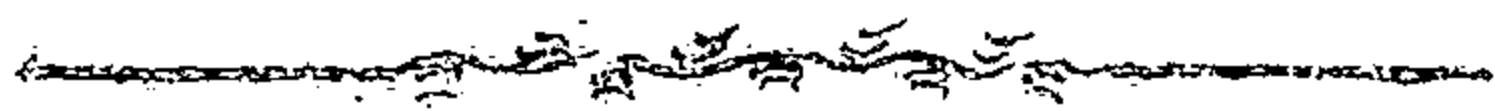
قبول کر سکتا ہے، جتنی کہ میرے تصور میں آسکتی ہیں، تو میں واضح  
 اور صحیح طور پر یہ نہ جان سکوں گا، کہ موم کیا ہے۔ لہذا ماننا ہے  
 کہ تصور سے میں یہ تک نہیں جان سکتا، کہ موم کیا ہے، اس سے  
 جاننا صرف فہم سے ممکن ہے۔ یہ تو موم کے اس خاص پیش نظر  
 ٹکڑے کا حال تھا، باقی عام موم کا تصور سے نہ معلوم ہو سکتا، تو  
 اور بھی عیاں ہے۔ آخر تو پھر موم کا یہ ٹکڑا جو صرف ذہن و فہم  
 ہی سے جانا جاسکتا ہے کیا ہے؟ یقیناً یہ وہی ہے، جس کو میں دیکھ چھو  
 اور تصور کر رہا ہوں مختصر یہ کہ یہ وہی ہے، جو اس کو میں شروع  
 سے مان رہا ہوں۔ البتہ جوابات یاد رکھنے کی ہے، وہ یہ ہے  
 کہ اس کا علم و ادراک نہ دیکھنے سے حاصل ہوا ہے، نہ چھونے  
 سے نہ تصور سے، اور پہلے بھی کبھی اسی طرح سے نہیں حال  
 ہوا تھا، گو ہم کو دھوکا اسی کا تھا، بلکہ دراصل یہ ادراک صرف  
 ہمارے ذہن کا ایک معائنہ یا وجدان ہے، جو کبھی ناقص و  
 ناقص ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے تھا، اور کبھی صاف و واضح جیسا  
 کہ اب ہے اور یہ وضاحت یا عدم وضاحت اسی پر موقوف  
 ہوتی ہے، کہ یہ جن چیزوں پر مشتمل یا جن اجزاء سے مرکب  
 ہے، ان پر ہماری توجہ زیادہ ہے یا کم۔  
 تاہم جب میں اپنے ذہن کی کمزوری کا خیال کرتا ہوں، اور  
 دیکھتا ہوں کہ کس طرح نادانستہ یہ غلطی میں پھنس جاتا ہے،  
 تو میرے تعجب کی انتہا نہیں رہتی۔ کیونکہ گو میں ان سب  
 باتوں کو زبان تک لائے بغیر محض اپنے اندر سوچ رہا ہوں،  
 پھر بھی الفاظ ہیں، کہ میری راہ میں حائل ہیں، اور یہ موم  
 کے معمولی لفظوں سے دھوکے میں آجاتا ہوں۔ کیونکہ اگر  
 موم سامنے رکھا ہے، تو ہم کہتے ہیں، کہ ہم وہی موم دیکھ رہے  
 ہیں، یہ نہیں کہتے کہ ہم اس کو وہی اسلئے سمجھ رہے ہیں کہ اس کا رنگ



شکل وہی ہے۔ اس سے دھوکا یہ ہو جاتا ہے، کہ موم کا علم  
 آنکھوں سے دیکھ کر حاصل ہو رہا ہے، حالانکہ یہ ہونا صرف ذہنی  
 وجدان سے ہے۔ لیکن جب میں کھڑکی سے جھانکتا ہوں اور دیکھتا  
 ہوں، کہ لوگ نیچے گلی میں گزر رہے ہیں، تو میں کہہ اٹھتا ہوں کہ  
 ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، جس طرح یہ کہہ دیتا تھا کہ موم کو دیکھ رہا ہوں  
 حالانکہ کھڑکی سے میں بخیر انگریزی ٹوپوں اور لباس کے اور کیا دیکھ  
 رہا ہوں، جو ممکن ہے، کہ مصنوعی پیشینوں کو پہنا دیا گیا ہو اور جو  
 محض کمانیوں سے چل رہی ہوں؟ مگر میں ان پر انسان ہونے کا  
 حکم لگاتا ہوں، اور اس طرح جس شخص کے مشفق یقین کر رہا ہوں  
 کہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، دراصل اس کو محض حکم لگانے  
 کی اس قوت سے سمجھ رہا ہوں، جو خود میرے ذہن کے اندر ہے۔  
 جو شخص اپنے علم کو عوام سے بلند قرار دینا چاہتا ہے،  
 اس کو عامیانہ زبان کے محاورات اور روزمرہ سے اپنے  
 شک کی تائید میں دلائل فراہم کرنے سے شرمانا چاہئے۔ لہذا  
 ایسا کرنے کے بجائے میں اب آگے بڑھتا ہوں، اور دیکھتا  
 ہوں، کہ مجھ کو موم کا پہلے پہل جو ادراک ہوا، جس کو میں یقین  
 کرتا تھا، کہ ظاہری حواس یا فہم سلیم یعنی قوت مشیلہ کے ذریعہ سے  
 جان رہا ہوں، وہ زیادہ واضح و اکمل تھا، یا جواب اس مزید  
 تحقیق کے بعد حاصل ہوا ہے، کہ موم دراصل کیا ہے اور اس  
 کو کس طرح جانا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے، کہ یہ سوال بھی مضحک ہوگا  
 اس لئے کہ پہلے پہل کے ادراک میں کون سی چیز تھی جو واضح تھی یا  
 یا کون سی ایسی بات تھی جس کا ادنیٰ سے ادنیٰ حیوان  
 کو احساس نہیں ہو سکتا؟ لیکن جب میں موم اور اس کی ظاہری صورت  
 میں فرق کرتا اور سمجھنا چاہتا ہوں کہ اس کے کپڑے اتار کر بالکل پرہیز  
 حالت میں غور کرتا ہوں، تو کو میرے فیصلہ یا حکم میں اب بھی غلطی کا

احتمال یقیناً ہے، تاہم اس طرح کا ادراک بغیر انسانی ذہن کے ممکن نہیں  
 لیکن سب سے آخری سوال یہ ہے، کہ خود اس ذہن یعنی اپنی  
 نسبت میں کیا فیصلہ ہے؟ اس لئے کہ اب تک میں نے اپنے کو صرف  
 ذہن ہی قرار دیا ہے۔ کیا میں جو نظام ہر موم کے اس نگار کے کا ایسی  
 قطعیت و وضاحت کے ساتھ تصور کر رہا ہوں خود اپنے کو نہیں مانتا  
 محض زیادہ قطعیت و صداقت ہی کے ساتھ نہیں، بلکہ زیادہ صحت  
 و وضاحت کے ساتھ بھی؟ کیونکہ اگر میں موم کے ہونے یا وجود کا اس لئے  
 حکم لگاتا ہوں، کہ اس کو دیکھ رہا ہوں، تو یہ نتیجہ اس سے بھی زیادہ بڑا  
 طور پر نکلتا ہے، کہ چونکہ میں اس کو دیکھتا ہوں، لہذا میں ہوں یا میں  
 خود موجود ہوں۔ اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ جس شے کو میں دیکھ رہا  
 ہوں دراصل موم نہ ہو، یہ بھی ممکن ہے، کہ میں کسی شے کے دیکھنے کے  
 لئے سرے سے آنکھیں ہی نہ رکھتا ہوں بلکہ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ  
 جب میں دیکھ رہا ہوں یا دیکھنے کے ہم منصب ہوں، تو یہ بھی ہے  
 کہ جب میں یہ خیال کر رہا ہوں کہ دیکھ رہا ہوں، تو میں جو خیال کر رہا ہوں  
 کچھ نہیں ہوں۔ اسی طرح اگر موم کے موجود ہونے کا حکم میں اس لئے  
 لگاتا ہوں، کہ اس کو چھو رہا ہوں، تو وہی نتیجہ پھر نکلا، یعنی میں  
 ہوں۔ اور اگر اس لئے یہ حکم لگاتا ہوں کہ میرا تخیل یا کوئی اور  
 سبب، خواہ وہ کچھ بھی ہو، اس کا ایضاً منجھو دلا رہا ہے، تو بھی  
 وہ نتیجہ ہر صورت نکلے گا کہ میں ہوں۔ جو کچھ میں نے یہاں موم  
 کے بارے میں کہا ہے، وہی ان تمام چیزوں پر صادق آسکتا  
 ہے جو میرے باہر بانی جاتی ہیں اور میرے باہر واقع ہوتی  
 ہیں۔ مزید براں اگر موم کا ادراک یا خیال محض دیکھنے یا چھونے  
 کے بعد زیادہ صحیح و صاف نہیں معلوم ہوا ہے، بلکہ اور بہت  
 سے اسباب نے اس کو میرے لئے زیادہ واضح بنا دیا ہے تو پھر  
 ماننا پڑے گا، کہ کس قدر زیادہ بدانت، وضاحت اور صحت

کے ساتھ میں خود اپنے کو اس وقت جان رہا ہوں۔ اس لئے  
 کہ سوچ یا کسی دوسرے جسم کی ماہیت کے تصور و علم میں جتنے  
 دلائل دستور بھی کام لیا گیا ہے، وہ سب کی سب خود میرے ذہن  
 کی ماہیت کے تحت ہی دلائل ہیں۔ ان کے علاوہ خود ذہن کے  
 اندر نہیں معلوم اور کتنی ایسی چیزیں ہیں جو اس کی حقیقت و  
 ماہیت پر روشنی ڈالتے ہیں، مگر یہ سب کتنی ہیں، لہذا مذکورہ بالا  
 قسم کے دلائل جو جسم پر موقوف ہیں، مشکل ہی سے قابل اعتنا ہیں۔  
 بالآخر میں ناگزیر اس نقطہ پہنچ گیا جس پر کہ پنچنا  
 چاہتا تھا۔ اس لئے کہ یہ اب بالکل صاف ہو گیا ہے کہ قطع  
 معنی میں اجسام تک کا علم جو اس یا قوت متخیلہ سے نہیں بلکہ محض  
 فہم سے ہوتا ہے۔ اور چونکہ ان کا علم اسلئے نہیں ہوتا کہ یہ مری  
 یا انورس ہوئے ہیں، بلکہ اس لئے کہ یہ فہم یا خیال میں واضح طور  
 سے آتے ہیں، لہذا اب اس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ  
 میرے لئے خود اپنے ذہن سے زیادہ کسی چیز کا جاننا آسان  
 نہیں۔ لیکن جس واسطے پر میں اتنے زمانہ سے جا ہوا ہوں،  
 چونکہ اس سے وحشہ شحات حاصل کرنا مشکل ہے، لہذا یہاں تک  
 پہنچ کر ذرا ٹھہر جانا بہتر ہوگا، تاکہ طویل و مسلسل تفکر کی مدد سے اس  
 مسئلے کو اپنے حلقہ میں زیادہ گہرائی کے ساتھ راسخ کر سکوں



# تفکر نمود

## خدا کا وجود

اب تھوڑی دیر کے لئے میں اپنی آنکھوں اور کانوں کو بند اور تمام حواس کو معطل  
 کئے لیٹا ہوں، حتیٰ کہ اپنے صفحہ خیال سے مادی اشیاء تک کی تمام صورتوں کو محو  
 کئے دیتا ہوں، لیکن ان کا بالکل محو کرنا چونکہ مشکل ہے، اس لئے کم از کم ان کو  
 کاف و باطل فرض کئے لیٹا ہوں، اور اس طرح صرف اپنے اندر محدود  
 رہ کر اپنی اندرونی حقیقت سے بتدریج مافوس ہونے کی کوشش کرتا اور  
 دیکھتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔ میں ایک ایسی چیز ہوں جو سوچتی ہے، یعنی جو شک  
 کرتی ہے، اقرار کرتی ہے، انکار کرتی ہے، جو کچھ چیزوں کو جانتی ہے، اور  
 بہت سی چیزوں سے جاہل ہے، جو محبت کرتی ہے، نفرت کرتی ہے،  
 ارادہ کرتی ہے، ارادہ سے باز رہتی ہے، غلیٰ ہذا جو خیال و احساس کرتی  
 ہے۔ جن چیزوں کا میں خیال و احساس کرتا ہوں ممکن ہے، کہ وہ ہوائے خود  
 خارج میں میرے باہر موجود نہ ہوں، جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ آیا ہوں، تاہم  
 ذہن کی وہ کیفیات جن کو میں خیالات و احساسات سے تعبیر کرتا ہوں،  
 وہ نفس ان کیفیات کی حد تک یقیناً میرے اندر موجود ہیں، اور میں سمجھتا

ہوں کہ ان مختصر نقطوں میں جو کچھ بھی میں حقیقتہً جانتا ہوں یا کم از کم اب تک جانتا ہے سب کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔

اس کے بعد میں اپنے علم کو آگے بڑھانے میں نہایت ہی ہوشیاری سے کام لوں گا، اور احتیاط کے ساتھ دیکھوں گا کہ آیا اس میں کچھ اور اضافہ کی گنجائش ہے۔ اتنا تو بہر حال یقینی ہے، کہ میں ایک ایسی شے ہوں جو سوچتی ہے، لیکن کیا اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے، کہ میں اس چیز کو بھی جانتا ہوں، جس کی بنا پر کسی شے کو یقینی کہا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے، کہ میرے ذہن کو یہ بالاولین علم میں جو چیز اس کی صداقت کا مجھے کو یقین دلانے والی ہے، وہ محض یہ بات ہے، کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس کو نہایت صاف و واضح طور پر محسوس کر رہا ہوں، اور اگر کبھی بھی ایسا ہوا ہوتا کہ کسی شے کو میں اس طرح صاف و واضح طور پر محسوس کرتا اور وہ غلط شکل جاتی، تو یہ صفائی و وضاحت اس یقین کے لئے ہرگز کافی نہ ہوتی۔ لہذا اب میں اس کو ایک کلی اصول قرار دے سکتا ہوں، کہ تمام ایسی چیزیں، جن کو ہم نہایت ہی صاف اور نہایت ہی واضح طور پر محسوس کرتے ہیں، وہ صحیح ہوتی ہیں۔

بائیں ہمہ میں نے پہلے ہی ایسی چیزوں کو پہلے یقینی و قطعی مان لیا تھا، جو بعد کو مشکوک و مشتبہ ثابت ہوئیں۔ یہ کیا چیزیں تھیں؟ رہیں، آسمان، ستارے، غرض تمام وہ چیزیں جن کو میں اس کے ذریعہ سے جانتا تھا، اسی طرح کی تھیں۔ اب دیکھو کہ ان کے اندر وہ کیا شے تھی، جس کو میں صاف و واضح طور پر جانتا تھا؟ ظاہر ہے، کہ یہ شے اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ان چیزوں کے خیالات یا تصورات میرے ذہن میں موجود تھے، اور اس کا میں اب بھی انکار نہیں کرتا، کہ یہ تصورات میرے اندر پیدا ہوئے ہیں لیکن ان میں ایک اور شے ایسی بھی شامل تھی، جس کا مجھ کو محض اس لئے یقین تھا کہ اس کو یقین کرنے کی عادت ہو گئی تھی یعنی میں اپنے نزدیک اس امر کو واضح طور پر محسوس کرتا تھا، کہ میں کے باہر اشیاء کا وجود ہے، جن سے یہ تصورات میرے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں، اور جو ہر جہان کے مشابہ ہیں، حالانکہ اس کا دراصلی نہ مجھ کو کوئی احساس تھا، نہ یہ خیال کسی علم پر



مبنی تھا، اور یہی میری خود فریبی تھی۔  
 لیکن جب کبھی حساب و ہندسہ کی کسی صفت و سہل بات کا میں نے  
 خیال کیا، مثلاً یہ کہ دو اور زمین ملکر پانچ ہوتے ہیں، یا اسی طرح کی اور باتوں کا،  
 تو کیا ان کی صداقت کا کم از کم اچھا خاصہ واضح اور اکٹھا ہونا حاصل تھا؟ البتہ  
 اگر بعد میں ان کو بھی میں نے قابل شک خیال کیا، تو اس کی وجہ میرے ذہن  
 میں اس کے سوا اور کچھ نہیں آ سکی، کہ ممکن ہے، ایک قادر مطلق خدا نے  
 میری فطرت ایسی بنا دی ہو کہ جن باتوں کو میں بالکل بدیہی طور پر جانتا ہوں،  
 ان میں بھی دھوکا کھارہا ہوں، کیونکہ جب میں خدا کی قدرت مطلقہ کا خیال  
 کرتا ہوں، تو مجبوراً ماننا پڑتا ہے، کہ اگر وہ چاہے، تو ایسی چیزوں میں بھی  
 مجھے کو دھوکا دے سکتا ہے، جن کا علم اپنے نزدیک ہیں نہایت ہی واضح  
 طور پر رکھتا ہوں، اور میری طرف جب اور حقیقی مرتبہ میں ان چیزوں کا خیال  
 کرتا ہوں، جن کو اپنے نزدیک نہایت وضاحت کے ساتھ جانتا ہوں، تو  
 بے ساختہ میری زبان پر اسی قسم کے الفاظ آ جاتے ہیں کہ جو چاہے مجھ کو  
 دھوکا دے، لیکن جب شک میں یہ مجھ رہا ہوں، کہ میں ہوں بہ کوئی نہیں  
 کر سکتا، کہ میں نہ ہوں، نہ آئندہ یہ یاد رکھا سکتا ہے کہ میں کبھی نہ تھا۔ اور انہی  
 اس وقت میں ہوں، نہ وہ یہ کر سکتا ہے کہ دو اور زمین کو پانچ سے کم یا زیادہ  
 بنا دے، یا اسی طرح کی کوئی اور ایسی بات کر دے، جس کے متعلق میں واضح  
 طور پر جان رہا ہوں، کہ نہیں ہو سکتی۔  
 اور چونکہ میرے پاس اس کی قطعاً کوئی دلیل نہیں کہ خدا دھوکا  
 دیتا ہے، بلکہ میرے سے ابھی اسی پر نہیں بحث کی ہے، کہ خدا موجود  
 بھی ہے، اس لئے جو شک محض اس فرق پر مبنی ہے، وہ نہایت کمزور  
 اور یوں کہو کہ مابعد الطبیعیاتی ہے۔ لیکن اس شک کو پوری طرح رفع کرنے  
 کے لئے جس قدر جملہ موقع مل سکے، وہ خدا پر بحث کر لینا ضروری ہے  
 اور اگر یہ نہایت ہو جائے کہ خدا ہے، تو ساتھ ہی اس کو بھی طے کر لینا چاہیے  
 کہ وہ دھوکا دے سکتا ہے یا نہیں، کیونکہ ان دونوں باتوں کا فیصلہ نہ کرے

بغیر میرے نزدیک کسی چیز کا علم و یقین نہیں حاصل ہو سکتا۔

اس غرض سے کہ میں نے اپنے تفکر کی جو شرط و ترتیب رکھی ہے (کہ اپنے ذہن کے ابتدائی خیالات سے ملکر بتدریج ان خیالات پر آؤنگا جو ان کے بعد پیدا ہوتے ہیں) اس میں کوئی غلطی نہ واقع ہو، ضروری ہے، کہ یہاں اپنے تمام خیالات کو چند اصناف میں تقسیم کر دوں، اور دیکھوں کہ ان میں خطا و صواب یا غلطی و صحت کا کن خیالات سے تعلق ہے میرے خیالات میں بعض تو ایسے ہیں، جن کو گویا اشیاء کی تصویر کہا جاسکتا ہے، اور تصورات صحیح معنی میں انہیں کا نام ہے مثلاً کسی آدمی کا تصور، آسمان کا تصور، فرشتہ کا تصور، خدا کا تصور یا محض کسی خیالی و فرضی عجب الخلق شے کا تصور دوسرے وہ خیالات ہیں جو کچھ دوسری طرح کی صورتیں رکھتے ہیں، مثلاً جب میں ارادہ کرتا ہوں یا ڈرتا ہوں، دعویٰ کرتا ہوں یا انکار کرتا ہوں، تو دراصل میرے سامنے کسی ایسی شے کا خیال ہوتا ہے، جس سے میں نے اس فعل کا تعلق ہوتا ہے، لیکن ساتھ ہی اس شے کا جو تصور مجھ کو حاصل ہے، اس میں کسی اور شے کا میں اضافہ بھی کر دیتا ہوں، اور اسی قسم کے خیالات میں سے بعض کو جذبات یا ارادات کہا جاتا ہے، اور بعض کو احکام یا تصدیقات۔

اب پہلے تصورات کو لو، کہ اگر ہم ان کو نفس تصورات کی حد تک سمجھیں اور کسی دوسری شے سے ان کو متعلق نہ کریں، تو صحیح معنی میں ان کو غلط یا کاوہ نہیں کہا جاسکتا، مثلاً میں بکری کا تصور کروں یا محض کسی خیالی عجیب الخلق شے کا، اتنا بہر حال صحیح ہے، کہ تصور وہ نفل کا کر رہا ہوں۔

اسی طرح جذبات یا ارادہ میں بھی ہم کو کذب و غلطی کے سوال کا اندیشہ نہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ گو میں غلط چیزوں کی خواہش یا ارادہ کر سکتا ہوں، یا ایسی چیزوں کی جن کا میرے سے کبھی وجود ہی نہ رہا ہو تاہم اتنا بہر حال صحیح ہے، کہ میں نے ان کی خواہش کی۔

لہذا اب صرف احکام یا تصدیقات رہ جائے ہیں، اور انہیں میں

فریب و غلطی سے بچنے کے لئے خاص طور پر خبردار رہنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اصلی اور سب سے عام غلطیاں جو احکام میں واقع ہو سکتی ہیں وہ اسی حکم میں ہیں، کہ میرے اندر جو تصورات پائے جاتے ہیں، وہ ان چیزوں کے مماثل یا مطابق ہیں جو میرے باہر موجود ہیں، اس لئے کہ اگر میں تصورات کو محض اپنے خیال کی خاص خاص صورتیں یا کیفیات سمجھتا ہوں اور کسی خارجی شے سے ان کو متعلق نہ کرتا، تو یہ مشکل ہی ہے مجھ کو کسی غلطی میں ڈال سکتے تھے۔

ان تصورات میں سے بعض تو مجھ کو خلق معلوم ہوتے ہیں، جو میرے ساتھ ہی پیدا ہوئے ہیں، اور بعض خارجی، جو معلوم ہوتا ہے، کہ باہر سے آئے ہیں، اور بعض خود ساختہ، جن کو میں نے خود بنایا ہے۔ مثلاً جس چیز کو لوگ بالعموم شے، فکر یا صداقت سے تعبیر کرتے ہیں، اس کو خیال کرنے کی قوت مجھ کو حاصل ہے، جو مجھے خود اپنی فطرت کے سوا کہیں اور سے مانو نہ نہیں معلوم ہوتی لیکن اگر میں کوئی آواز سن رہا ہوں یا آفتاب کو دیکھ رہا ہوں یا گرمی محسوس کر رہا ہوں، تو اب تک میں یہی حکم لگاتا رہا ہوں، کہ یہ احساسات ایسی چیزوں سے پیدا ہو رہے ہیں، جو میرے باہر موجود ہیں باقی بہت الجھتا ہوں، پوچھتا ہوں وغیرہ کی سی خیالی عجائب المخلوقات خود ذہن کی ایجادات و اختراعات معلوم ہوتی ہیں، مگر ساتھ ہی میں ان سب کی سب یعنی تینوں قسم کے تصورات کو خارجی، خلقی، یا خود ساختہ بھی سمجھ لے سکتا ہوں اس لئے کہ اب تک واضح طور پر میں نے ان کی اہل کاپتہ نہیں لگایا ہے یہاں خصوصیت سے مجھ کو ان تصورات پر غور کرنا ہے، جو خارجی اشیاء سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ اور دیکھنا ہے، کہ وہ کیا وجوہ ہیں، جن کی بناء پر میں ان کو خارجی اشیاء کے مماثل باور کرنے پر مجبور ہوتا ہوں۔

اس کی سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے، کہ ایسا باور کرنا بالکل فطری معلوم ہوتا ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے، کہ میں ان تصورات کو اپنے ارادہ کے تابع نہیں پاتا، کیونکہ یہ اکثر میرے ارادے کے خلاف پیدا ہوئے رہتے ہیں۔ مثلاً اسی وقت لو کہ میں ارادہ کروں یا نہ کروں،

لیکن گرمی محسوس کر رہا ہوں، لہذا میں سمجھتا ہوں کہ یہ احساس یا گرمی کا یہ تصور میرے اندر رہا میرے سوا کوئی شے یعنی وہ آگ پیدا کر رہی ہے، جس کے پاس میں بیٹھا ہوں، اور ظاہر ہے، کہ یہ شے میرے اندر جو اثر پیدا کرے گی، اس کا کچھ اور ہونے کے بجائے خود اس شے کے مسائل ہونا زیادہ معقول بات ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے، کہ آیا وہ بالاکافی قوی اور تشفی بخش ہیں یا نہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ یہ امر محض بالکل فطری معلوم ہوتا ہے، تو لفظ فطرت سے میری مراد یہاں محض ایک خاص رجحان ہوتا ہے جو اشیاء اور ان کے تصور رات کے مابین مماثلت کے یقین پر مائل کرتا ہے، نہ یہ کہ فطری روشنی اس کی صداقت کا یقین دلاتی ہے۔ اور ان دونوں میں بہت فرق ہے، اس لئے کہ جس شے کی صداقت فطری روشنی پر مبنی ہو، اس پر میں اسی طرح کوئی شبہ نہیں کر سکتا جس طرح مثلاً اس امر میں، جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا، کہ چونکہ میں شک کرتا ہوں اس لئے میں ہوں کیونکہ میرے اندر حق و باطل کے امتیاز کی کوئی اور ایسی قابل اعتبار قوت نہیں موجود، جو مجھ کو یہ بتلا سکے کہ فطرت کی روشنی جس شے کو حق کہتی ہے وہ حق نہیں ہے۔ باقی رہا مذکورہ بالا رجحان، تو اس قسم کے رجحانات کی نسبت میں نے بار بار کہا ہے، کہ جب میرے محلے میں تمیز و اختیار کا سوال پیدا ہوا ہے، تو یہ جس قدر مجھ کو بھلائی کی طرف لے گئے ہیں، اس سے کم برائی کی طرف نہیں لے گئے۔

یہی دوسری دلیل یا وجہ کہ چونکہ یہ تصور رات میرے ارادے کے تابع نہیں ہوتے، لہذا ان کو کہیں اور سے اخذ ہونا چاہئے، یہ بھی پہلی دلیل سے زیادہ تشفی بخش نہیں۔ اس لئے کہ جس طرح مذکورہ بالا رجحانات خود میرے ہی اندر پائے جاتے ہیں، گو ہمیشہ وہ میرے ارادے کے موافق نہیں ہوتے، اسی طرح ممکن ہے، کہ خود میرے ہی اندر کوئی ایسی قوت بھی موجود ہو، جو ظاہری اشیاء کی اعانت کے بغیر ان تصور رات کو پیدا کر سکتی ہو، اور جس کا اب تک مجھ کو علم نہ ہو، اس لئے کہ آخر خواب کی



صورت میں تو یہ ہوتا ہی ہے، کہ خارجی اشیا کے بغیر یہ تصورات میرے اندر پیدا ہوتے ہیں اس کے علاوہ اگر ان بھی لوں کہ یہ تصورات خارجی اشیا سے پیدا ہوتے ہیں، تو بھی ان اشیا کے حامل ہونا ان لازم نہیں آتا۔ بلکہ اس کے برخلاف تعمیری صورتوں میں لئے دیکھا ہے کہ نئے اور اس کے تصور میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً آفتاب کو لو کہ اس کے دو مختلف تصورات میرے اندر موجود ہیں، ایک حواس سے حاصل ہوا ہے، جس کو ان تصورات میں شامل کرنا چاہئے، جو خارج سے آتے ہیں، اور جس کی رو سے آفتاب بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا دوسرا تصور جو علم ہئیت سے حاصل ہوتا ہے، یعنی جو میری فطرت کے بعض پیدا کی خیالات پر مبنی یا کسی نہ کسی طرح خود میرا بنایا ہوا ہے، وہ اتنا بڑا ہے، کہ سارے کرۂ ارض سے بھی کئی گنا بڑا سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں تصورات ایک ہی آفتاب کے نہیں ہو سکتے، اور عقل کہتی ہے، کہ ان میں سے جو تصور براہ راست حواس سے حاصل ہوا ہے، وہی واقعی آفتاب ہے بہت زیادہ مختلف و غیر مماثل ہے۔ ان تمام باتوں سے ابھی طرح ثابت ہوتا ہے، کہ میرا یہ یقین کہ میری ذات سے باہر کچھ چیزیں موجود ہیں، جو آلات حل یا کسی اور ذریعہ سے اپنے تصورات یا تمثالات مجھ تک پہنچاتی اور میرے ذہن پر اپنے مماثل ارتکابات پیدا کرتی رہتی ہیں، کسی قطعی و معقول دلیل پر نہیں مبنی بلکہ محض اہرصاد و حدس اور عاجلانہ فیصلہ کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس امر کی تحقیق کے لئے کہ جن چیزوں کے تصورات ہمارے اندر موجود ہیں، ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو بذات خود ہمارے باہر موجود ہیں، ایک اور راہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ ان تصورات کو اگر شعور کی محض خاص حاصل کیفیات و احوال قرار دیا جائے، تو پھر ان میں مجھ کو کوئی فرق تفاوت نہیں معلوم ہوتا، اور سب کی سب یکساں طور پر خود میرے ہی اندر سے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر ان کو ایسی تمثالات قرار دیا جائے جن میں سے ہر تمثال ایک خاص شے کی نمائندگی کرتی ہے،



تو ظاہر ہے، کہ پھر یہ باہم نہایت ہی مختلف و متفاوت ہونگی۔ اس لئے کہ جو مثالیں جو اہر کی نمائندگی کرتی ہیں، وہ یقیناً اپنے اندر کچھ زیادہ شے رکھتی ہیں، بالفاظ دیگر زیادہ حقیقت و واقعیت پر مشتمل ہوتی ہیں، یعنی بہ نسبت ان مثالوں کے جو محض اعراض یا کیفیات کی نمائندگی کرتی ہیں، یہ اپنی نمائندگی میں ہستی یا کمال کے اعلیٰ مراتب کی مالک ہوتی ہیں اس کے علاوہ خدا کے برتر کا جو تصور میں رکھنا ہوں، جس کی رو سے اس کو ازلی ابدی، غیر محدود، غیر متغیر، عالم غیب، قادر مطلق، اور خود اس کی ذات سے باہر تمام چیزوں کا خالق خیال کرتا ہوں، یہ تصور، میں کہتا ہوں کہ یقیناً محدود و جواہر کے تصور اس کی بہ نسبت اپنے اندر بہت زیادہ حقیقت و واقعیت رکھتا ہے۔

اب فطرت کی روشنی ہم کو بدیہت بتاتی ہے کہ کسی شے کی علت تامہ میں کم از کم اتنی ہی حقیقت پائی جانی چاہئے جتنی کہ خود معلول میں پائی جاتی ہے، اس لئے کہ معلول میں جو کچھ پایا جاتا ہے، وہ بحر علت کے اور آہی کہاں سے سکتا ہے؟ اور معلول کے اندر علت کسی ایسی حقیقت کو کیسے پیدا کر سکتی ہے جو خود اس کے اندر نہیں موجود؟ لہذا معلوم ہوا، کہ نہ صرف ہستی کو نہیں پیدا کر سکتی، بلکہ جو شے زیادہ کامل ہے، یعنی زیادہ حقیقت پر مشتمل ہے، وہ کم کامل کی معلول نہیں ہو سکتی، اور یہ صرف ان معادلات ہی پر صادق نہیں آتا جو فلاسفہ کی اصطلاح میں واقعی یا صوری حقیقت رکھتے ہیں، بلکہ ان تصور اس پر بھی، جن میں ہم محض اسی حقیقت کا خیال کرتے ہیں، جس کو وہ خارجی کہتے ہیں۔ مثلاً ایک پتھر کو جو اب تک وجود میں نہیں آیا ہے، وہ اس وقت تک بھی بغیر ایک ایسی شے کے وجود میں نہیں آسکتا جو اپنے اندر صوری یا اعلیٰ طور پر تمام ان چیزوں کو نہ رکھتی ہو جو پتھر کی ساخت میں داخل ہیں، یعنی جس میں وہی چیزیں پائی جاتی ہوں جو پتھر میں پائی جاتی ہیں، یا اور چیزیں جو پتھر سے اعلیٰ ہیں۔ اس طرح مثلاً شے گرم نہیں ہے، اس میں گرمی وہی شے پیدا کر سکتی ہے، جو اپنے درجہ و نوعیت کے لحاظ سے اتنی ہی کامل ہے، جتنی کہ گرمی، یہی حال اور تمام چیزوں کا بھی

ہے۔ بلکہ مزید برآں پتھر یا گرمی کا تصور تک میرے اندر صرف کوئی ایسی ہی علت پیدا کر سکتی ہے، جو کم از کم اتنی ہی حقیقت رکھتی ہے، جتنی کہ میں پتھر یا گرمی کے اندر موجود خیال کر رہا ہوں، اس لئے کہ گو یہ علت میرے تصور میں اپنی ضروری یا واقعی حقیقت کو پیدا نہیں کرتی تاہم اس کے یہ معنی نہیں کہ اس علت کو کم حقیقتی ہونا چاہئے لیکن چونکہ ہر تصور ذہن کا ایک فعل ہوتا ہے، اس لئے اس کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ بذات خود اصل ضروری حقیقت سے علاوہ کسی اور کا مقتضی نہیں ہوتا، جو خیال یا ذہن سے اس کو ملتی ہے، جس کی محض یہ ایک حالت یا صورت ہوتا ہے، لہذا کسی تصور میں جو خاص ذہنی یا خارجی حقیقت پائی جاتی ہے وہ لازماً کسی ایسی علت سے مانع ہو رہی ہوتی ہے، جس میں واقعاً کم از کم ایسی قدر حقیقت موجود رہی ہو، جس قدر کہ اس تصور میں ذہن یا موجود ہے، کیونکہ اگر ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ تصور میں کوئی ایسی شے موجود ہے جو اس کی علت میں نہیں ہے، تو پھر مٹا پڑے گا کہ تصور میں یہ شے غیبتی یا کتم عدم سے آئی ہے، ذہن کے اندر بصورت تصور کسی شے کا وجود خواہ کتنی ہی ناقص حالت میں کیوں نہ پایا جاتا ہو، تاہم اس حالت وجود کو عدم تو بہر حال کسی طرح نہیں کہا جاسکتا نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تصور کتم عدم سے وجود میں آیا ہے نہ یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ تصورات میں جو حقیقت پائی جاتی ہے، چونکہ وہ محض ذہنی ہوتی ہے، اس لئے ان تصورات کی علتوں میں اس کا واقعاً موجود ہونا ضروری نہیں، بلکہ ان میں بھی ذہنی ہی طور پر پایا جانا کافی ہے، اس لئے کہ جس طرح ذہنی وجود کی صورت کا تعلق تصورات کے ساتھ ان کی مخصوص نوعیت کے لحاظ سے ہوتا ہے، اسی طرح واقعی وجود کی صورت کا تعلق ان تصورات کی علتوں و یا کم از کم اصلی و ابتدائی علتوں کے ساتھ ان کی مخصوص نوعیت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اور اگرچہ ایک تصور دوسرے تصور پر ہی سے پیدا ہو سکتا ہے، لیکن یہ سلسلہ لایالی نہایت نہیں جاسکتا، بالآخر اس کو کسی ایسے ابتدائی

تصور پر ختم ہونا چاہئے، جس کی علت کو بطور اصل یا بنیاد کے اس کی ساری حقیقت یا کمال پر واقعاً مشتمل ہونا چاہئے، جو ان تصورات میں محض ذہنی یا استحضاری طور پر موجود ہے۔ اس طرح فطرت کی روشنی صاف طور سے مجھ کو بتلا رہی ہے، کہ ذہنی تصورات کی نوعیت تمائیل یا قصاویر کی سی ہے، جو کمال میں ان اشیاء سے جن سے یہ لی گئی ہیں جو ریاضیاتی یا آسانی ہو سکتی ہیں، لیکن ان سے زیادہ یا کامل تر کسی شے پر مرکب نہیں ہو سکتیں۔

مذکورہ بالا امور پر جس قدر زیادہ اور توجہ کے ساتھ غور کرتا ہوں، اسی قدر ان کی صداقت زیادہ واضح و روشن معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان سے آخر میں نتیجہ کیا نکالنا چاہتا ہوں؟ میں نتیجہ یہ نکالنا چاہتا ہوں، کہ اگر میرا کوئی تصور کسی ایسی ذہنی حقیقت یا کمال پر مشتمل ہو، جس کی نسبت مجھ کو صاف طور پر نظر آتا ہو، کہ خود میرے اندر یہ یا اس سے بڑھ کر موجود نہیں ہے، اور اس لئے میں خود اس کی علت بھی نہیں ہو سکتا، تو اس سے لازماً نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ دنیا میں تنہا میں ہی نہیں ہوں، بلکہ کوئی اور شے بھی موجود ہے جو اس تصور کی علت ہے۔ برخلاف اس کے اگر اس قسم کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہ پایا جاتا ہو، تو پھر، کوئی دلیل بھی مجھ کو یہ باور نہیں کر سکتی، کہ میرے علاوہ کچھ اور بھی موجود ہے، کیونکہ میں نے خوب ابھی طرح جانچ لیا ہے، کہ کوئی اور دلیل ایسی نہیں موجود۔

اب میں اپنے تصورات کا جائزہ لیتا ہوں، تو دیکھتا ہوں کہ میں خود میری ذات کے تصور کے علاوہ جس میں کوئی دشواری نہیں، خدا کا تصور پایا جاتا ہے، جس میں اور بے جان اشیاء کے تصورات، ہر شے کے تصورات، جانوروں کے تصورات، اور خود میرے جیسے وجود کے تصورات، ان میں سے کسی تصور سے پائے جاتے ہیں۔ لیکن جانوروں، ہر شے، یا میرے جیسے وجود کے تصورات ان کے تصورات ایسے ہیں کہ ان کے متعلق آسانی سے میں خیال کر سکتا ہوں، کہ یہ خدا اور جہانی اشیاء کے تصورات کو ملا کر بنائے جاسکتے ہیں، ان کو، میرے سوا

دنیا میں واقعانہ کوئی انسان موجود ہو نہ جانور نہ فرشتہ۔ رہے جسمانی اشیاء کے  
تصورات تو ان میں مجھ کو کوئی ایسی بڑی یا اعلیٰ شے نہیں ملتی، جو خود مجھ سے نہ  
پیدا ہو سکتی ہو۔ اس لئے کہ اگر ان کو زیادہ غور سے دیکھوں، اور اسی طرح انکی  
تحقیق کروں، جس طرح موم کے تصور کی کل کی تھی تو ان میں بہت ہی کم ایسی چیزیں  
نظر آتی ہیں، جو صاف و واضح طور پر خیال میں آتی ہوں۔ صرف ذیل کی چند چیزیں  
ایسی ہیں، یعنی مقدار بالکل و عرض و عمق میں ان کا پھیلاؤ و امتداد، شکل جو اس  
امتداد کی تحدید سے پیدا ہوتی ہے، وضع جو مختلف شکل کے اجسام باہم ایک  
دوسرے کے لحاظ سے رکھتے ہیں، اور حرکت جو اس وضع کی تبدیل کا نام ہے۔  
خیر جو ہر مادہ اور عدد کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے باقی رہیں دوسری چیزیں مثلاً  
روشنی، رنگ، آواز، بو، مزہ، سردی گرمی وغیرہ تو ان کے تصورات اس قدر  
وضد لے اور گنجلک ہوتے ہیں، کہ یہ تک نہیں معلوم ہوتا، کہ آیا یہ صحیح ہیں یا غلط،  
یعنی یہ دراصل حقیقی اشیاء کے تصورات ہیں بھی یا نہیں۔ اگرچہ میں پہلے یہ  
کہہ آیا ہوں، کہ صحیح اور غلط یا صدق و کذب کا احتمال صرف تصدیقات یا احکام  
میں ہوتا ہے، تاہم ایک قسم کا مادی کذب تصورات میں بھی پایا جاسکتا ہے،  
وہ اس طرح کہ جو شے واقعانہ موجود ہو، ایسا معلوم ہو کہ موجود ہے۔ مثلاً سردی اور  
گرمی کے جو تصورات ہیں رکھتا ہوں، وہ ایسے ضد لے اور نا صاف ہیں کہ ان سے  
یہ بہت نہیں چلتا کہ سردی گرمی کا سلب ہے یا گرمی سردی کا، یا دونوں حقیقی صفات  
ہیں یا پھر دونوں غیر حقیقی ہیں، یا انھیں تصورات کی نوعیت جو کہ تمنا لبت یا  
تصاویر کی سی ہے، اس لئے ہر تصور سی نہ کسی شے کا نمائندہ یا حضار معلوم ہوتا ہے۔ اب  
اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ سردی گرمی کے محض سلب کا نام ہے تو جو تصور سردی کو  
ایک حقیقی و ایجابی شے کی حیثیت سے نمایاں کر رہا ہے، اس کو غلط یا کاذب  
کہنا بجا نہ ہوگا، یہی حال دیگر تصورات کا بھی ہے۔ اصل یہ ہے، کہ اس  
قسم کے تصورات کے لئے ضرورت ہی نہیں، کہ ان کا خالق میں اپنے سوا  
کسی اور کو قرار دوں۔ کیونکہ اگر یہ کاذب ہیں، یعنی جن چیزوں کی یہ نمائندگی  
کرتے ہیں۔ ان کا سرے سے وجود ہی نہیں، تو ہر بات یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ



وہ کسی چیز سے حاصل نہیں ہوئے بلکہ یعنی ان کا وجود صرف میرے اندر ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ میرے اندر کوئی نقص یا کمی ہے۔ اور اگر یہ تصور ثابت صادق نہیں ہوتا، تو اس صورت میں بھی چونکہ یہ اس قدر کم حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں، کہ جس شے کی یہ نمائندگی کرتے ہیں اس کو میں لاسے تک سے ممتاز نہیں کر سکتا، لہذا سمجھ میں نہیں آتا، کہ میں خود ہی اپنے کو ان کا خالق کیوں نہ سمجھوں۔

باقی جسمانی اشیاء کے متعلق، جو صاف و واضح تصورات مجھ کو حاصل ہیں، ان میں سے بعض تو ایسے ہیں، جن کا خود اپنی ذات کے تصور سے حاصل کرنا بھی ممکن ہے، مثلاً جو ہر، مرور اور عدد وغیرہ کے سے تصورات۔ اس لئے کہ جب میں پتھر کے جوہر یا قائم بالذات ہونے کا خیال کرتا ہوں، اور خود اپنے کو بھی جوہر سمجھتا ہوں، تو گو یہ جانتا ہوں کہ میں ایک ذی شعور و غیر مستند شے ہوں، بخلاف اس کے پتھر بے شعور و مستند شے ہے، اور اس طرح دونوں کے تصورات میں کھلا بوا فرق ہے، تاہم اس امر میں دونوں برابر ہیں کہ جوہر میں اس طرح جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اس وقت موجود ہوں، اور اس سے پہلے بھی موجود تھا، نیز اپنے خیالات میں اختلاف اور مختلف خیالات کی تعداد کا بھی شعور رکھتا ہوں، تو اپنے اندر ہی مجھ کو مرور اور عدد کے تصورات بھی مل جاتے ہیں، جن کو بعد میں جس شے کے متعلق چاہوں استعمال کر سکتا ہوں۔

ان کے علاوہ جو دیگر صفات جسمانی اشیاء کے تصورات میں شامل ہیں، یعنی امتداد، شکل و وضع اور حرکت اس میں شک نہیں کہ یہ فی الحقیقت میرے اندر نہیں موجود کیونکہ میں صرف ایک ذی شعور یا خیال کرنے والی شے ہوں، لیکن یہ صفات چونکہ جوہر ہی کے خاص خاص احوال ہیں، اور میں بھی ایک جوہر ہوں، اس لئے ممکن ہے کہ یہ بھی میرے اندر بدستور اولیٰ پاسے جاسے ہوں۔

لہذا اب صرف خدا کا تصور رہنما ہے، جس میں مجھ کو دیکھنا ہے، کہ کوئی ایسی شے باقی جاتی ہے جو خود میری ذات سے ماخوذ نہ ہو سکتی ہو، لفظ خدا میری مراد ایک ایسا جوہر ہے، جو نامحدود ہے، نہ لی ہے، ابدی ہے،



بے نیاز ہے، قادر مطلق ہے، ہمہ دان ہے، اور میرا نیز تمام چیزوں کا دیشٹر ہے۔  
میرے سوا کچھ اور موجود ہو (خالق ہے) ظاہر ہے کہ یہ صفات اس قدر اعلیٰ و  
برتر ہیں، کہ جتنا زیادہ ان پر غور کرتا ہوں، اتنا ہی زیادہ یہ قبول کرنا دشوار  
معلوم ہوتا ہے، کہ ان کے تصور است کا پیدا و نشا صرف میری ذات  
ہو سکتی ہے، لہذا ان تمام باتوں سے لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خدا موجود  
ہے۔ اس لئے کہ نفس جو ہر تصور اگرچہ میرے اندر موجود ہے، کیونکہ  
میں خود جو ہر ہوں، تاہم جو تکمیل ایک محدود ہستی ہوں، لہذا نامحدود جو ہر کا تصور  
میرے اندر ہے اس کے نہیں پیدا ہو سکتا، کہ کوئی نامحدود جو ہر واقعاً موجود ہو،

جس نے یہ تصور مجھ کو دیا ہو۔  
یہ خیال کرنا چاہئے کہ نامحدود کا یہ تصور ایجابی نہیں، بلکہ عیروہ کے محض سلب کا  
نام ہے، جس طرح کہ سکون و تاریکی، حرکت و روشنی کے سلب کا نام ہے۔ اس لئے کہ  
نامحدود جو ہر تو ہر ہر نامحدود جو ہر کی بہ نسبت زیادہ حقیقت پر مشتمل نظر آتا ہے، اور  
اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نامحدود کا تصور میرے اندر کسی نہ کسی طرح محدود کے  
تصور سے قبل ہی موجود ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ خدا کا تصور مجھ کو  
اپنی ذات کے تصور سے پہلے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر میں اپنی ذات سے کامل تر  
ذات کا تصور پہلے سے اپنے اندر نہ رکھتا جس کے مقابلہ سے اپنے نقائص کو  
جان سکوں، تو پھر میرے لئے یہ جاننا کیسے ممکن تھا، کہ میں شک کرتا ہوں  
میں خواہش کرتا ہوں، یعنی میرے اندر کچھ کمی ہے، اور میں ہر طرح کمال نہیں ہوں؟  
اور یہ نہیں کہا جاسکتا ہے، کہ خدا کا یہ تصور مادی طور پر غلط ہے، لہذا  
اس کو لاشے سے حاصل کیا جاسکتا ہے، یعنی یہ میرے اندر اس لئے پایا جاسکتا  
ہے کہ میں ناقص ہوں، جیسا کہ سر دی و گری و غیرہ کے سے تصورات کے متعلق پہلے  
کہہ آیا ہوں، کیونکہ خدا کا تصور ان تصورات کے برخلاف نہایت ہی صاف و  
واضح ہے اور کوئی تصور انہی حقیقت و واقعہ پر مشتمل نہیں، جتنا کہ یہ ہے، نہ کوئی  
تصور بذات خود اس سے زیادہ صحیح یا اس سے کم غلط و غلطی کا متحمل ہو سکتا ہے۔  
کامل ترین و نامحدود ہستی کا یہ تصور میں کہتا ہوں، کہ نہایت ہی صحیح و

صادق ہے۔ اس لئے کہ گو یہ وہم کیا جاسکتا ہے، کہ ہوو ایسی ہستی واقعاً نہ موجود ہو، تاہم یہ وہم کسی طرح نہیں کیا جاسکتا، کہ اس ہستی کا تصور اسی طرح کسی حقیقی شے کا نام نہ نہیں ہے جس طرح کہ ابھی اوپر سردی کے تصور کے متعلق میں کہہ آیا ہوں۔ نیز یہ تصور نہایت صاف و واضح بھی ہے، اس لئے کہ جو کچھ بھی کسی کمال پر مشتمل حقیقی و صادق شے کے متعلق واضح و صاف طور پر ذہن میں آتا ہے، وہ سب اسی تصور میں داخل ہے، اور اگرچہ میں نامحدود کا احاطہ نہیں رکھتا، نہ خدا کی ذات کے اندر جو نامحدود چیزیں موجود ہیں ان کا احاطہ کر سکتا ہوں، بلکہ میرے خیال تک کی وہاں رسائی نہیں ممکن، اس لئے کہ نامحدود کی ماہیت ہی میں یہ داخل ہے، کہ میں جو محدود ہوں اس کا احاطہ نہ کر سکوں، تاہم اس سے جس تصور خدا کی صداقت میں فرق نہیں آتا، اور میرا وہی طرح سمجھنا اور حکم لگانا کہ جن چیزوں کو میں واضح طور پر خیال کرتا ہوں، اور جن میں میں جانتا ہوں کہ کچھ کمال موجود ہے بلکہ اور ایسی نامحدود چیزیں جن سے میں جاہل ہوں، یہ سب خدا کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں، اس امر کے لئے کافی ہے، کہ خدا کا جو تصور میں رکھتا ہوں، وہ میرے ذہن کے تمام تصورات سے زیادہ صحیح و صادق اور صاف و واضح ہے۔

البتہ ایک احتمال یہ ہو سکتا ہے کہ میں جو کچھ اور جتنا اپنے کو سمجھ رہا ہوں، دراصل اس سے زیادہ ہوں اور خدا کی ذات سے جن کمالات کو میں منسوب کر رہا ہوں، وہ بالکل خود میرے اندر ہی کسی نہ کسی طرح موجود ہیں گو ابھی تک فعلیت میں نہیں آئے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اب بھی اس امر کو جانتا ہوں، کہ میرا علم آہستہ آہستہ ترقی و کمال کی طرف جا رہا ہے، اور مجھ کو کوئی ایسی شے نہیں معلوم ہوتی جو اس تدریجی ترقی کو نامحدودیت تک پہنچانے میں حائل یا مانع ہو، نہ اس کی کوئی وجہ نظر آتی ہے کہ علم کی اس ترقی و تکمیل سے میں دیگر کمالات الہیہ تک کیوں نہیں پہنچ سکتا، نہ یہ سمجھ میں آتا ہے، کہ جب خود ان کمالات کو حاصل کرنے کی قوت میرے اندر موجود ہے، تو پھر ان کا تصور آخر میں کیوں نہیں پیدا کر سکتا ہوں۔ لیکن اگر ذرا

مزید غور سے کام لوں، تو واقعہ یہی ہے کہ ان کمالات کا تصور میں خود نہیں پیدا کر سکتا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے، کہ گو یہ صحیح ہے، کہ میرا علم روز بروز کمال کی طرف جا رہا ہے، اور میری فطرت میں بہت سی ایسی چیزیں بالقوہ موجود ہیں، جو اب تک فعلیت میں نہیں آئی ہیں، تاہم خدا کا جو تصور میں رکھتا ہوں، اس سے ان بالقوہ صفات یا کمالات کو ادنیٰ مناسبت بھی نہیں، کیونکہ اس کے تمام کمالات بالفعل ہیں اور کوئی صفت بھی محض بالقوہ نہیں ہے۔ اور کیا میرے علم کے نقص و بے کمالی کی خود یہی قطعی و غیر مشتبہ دلیل نہیں ہے، کہ اس کی ترقی آہستہ آہستہ بتدریج ہوتی ہے؟ اس کے علاوہ اگرچہ میرا علم روز بروز ترقی کر رہا ہے، پھر بھی میں یہ بھی طرح سمجھتا ہوں، کہ یہ فی الواقع نامحدودیت تک کبھی نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ اس کے لئے کوئی ایسا درجہ کمال نہیں ہو سکتا، جس کے بعد مزید کمال کی گنجائش نہ رہے بخلاف اس کے خدا کو میں بالفعل ہی اتنا نامحدود و خیال کرتا ہوں، کہ اس کے انتہائی کمال پر اب مزید اضافہ کی گنجائش ہی نہیں۔ سب سے آخری بات یہ ہے، کہ جو تصور اپنی ہستی بالفعل رکھتا ہے، ظاہر ہے، کہ وہ کسی ایسی ہستی کا آفریدہ نہیں ہو سکتا جو محض بالقوہ موجود و بے حسی کے معنی میں جوچھوٹا موجود ہونے کے ہیں غرض یہ تصور کسی واقعی بالفعل ہستی کا آفریدہ ہو سکتا ہے۔

جو کچھ میں نے ابھی اوپر کہا ہے، اس میں قطعاً کوئی بات بھی ایسی نہیں جو فوری و توجہ سے کام لینے پر بہ آسانی فطرت کی روشنی میں نظر نہ آ سکتی ہو۔ لیکن جہاں توجہ میں کچھ سستی کرتا ہوں، تو حسی اشیاء کے تصورات و ان پر مبادل کی طرح چھا جاتے ہیں، اور ایسا اندھا کر دیتے ہیں، کہ یہ یاد نہیں رہتا کہ مجھ سے کال ٹرہنی کا جو تصور مجھ کو حاصل ہے، اس کے لئے کیوں ضروری ہے، کہ کسی ایسی ہی ہستی کا آفریدہ ہو، جو واقعی مجھ سے زیادہ کمال ہے۔ اس لئے میں جاہلتا ہوں، کہ آگے ذرا اس کی بھی تحقیق کر لیجائے، تاکہ یا میں خود جس کے اندر خدا کا یہ تصور ہے، بغیر خدا کے وجود میں آ سکتا تھا۔ اور

یو چھٹا ہوں، کہ اگر خدا نے مجھ کو نہیں پیدا کیا، تو یہ بھر میں کیسے پیدا ہو؟ ظاہر ہے کہ اسی صورت میں یا خود میں نے اپنے کو پیدا کیا ہوگا، یا باپ نے یا کچھ اور اسباب و علل ہوں گے جو خدا سے کم کامل ہیں، کیونکہ اس سے زیادہ کامل یا اس کے مساوی تو کوئی شے ہو ہی نہیں سکتی۔

لیکن اگر میں سب سے بے نیاز اور خود ہی اپنا خالق ہوتا، تو مجھ کو کسی شے میں شک نہ ہونا چاہئے تھا نہ میرے اندر کوئی خواہش ہونی چاہئے تھی، غرض کوئی ایسا کمال نہ ہوتا چاہئے تھا جو مجھ میں موجود نہ ہو۔ اس لئے کہ میں اپنے کو تمام وہ کمالات عطا کر دیتا جن کا مجھ کو کچھ بھی تصور حاصل ہے، اور اسی طرح گو یا خود ہی خدا ہوتا۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے، کہ جن چیزوں کی مجھ میں کمی ہے، وہ ان چیزوں سے زیادہ دشوار ہیں، جو مجھ میں موجود ہیں، بلکہ اس کے برخلاف یہ البتہ نہایت ہی دشوار تھا، کہ میں یعنی ایک ذی فکر ہستی لاشے سے پیدا ہو جاتا، باقی جن چیزوں کا مجھ کو علم نہیں حاصل انکا علم ہو جانا یہ تو مقابلہ بہت ہی آسان بات ہے، کیونکہ علم تو بہر حال ذی فکر ہر کے اعراض ہی میں داخل ہے، اور یہ بالکل یقینی امر ہے، کہ اگر میں خود ہی اپنا خالق ہوتا، تو کم از کم ایسی چیزوں سے تو بہرگز میں اپنے کو محروم نہ کرتا، جو نسبت زیادہ آسان تھیں، جیسے کہ مثلاً علم کی نامحدودیت ہی ہے، جو مجھ کو حاصل نہیں، بلکہ خدا کے تصور میں جو چیزیں بھی داخل ہیں، ان میں سے کسی سے بھی میں اپنے کو محروم نہ کر سکتا، اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں، جس کی تخلیق خود میری ذات کی تخلیق سے زیادہ مشکل معلوم ہوتی ہو، اور جب اپنی تمام چیزوں کا میں خود ہی خالق ہوں، تو اگر کوئی ایسی مشکل چیز ہوتی بھی، تو اس اشکال کا مجھ کو علم ہو نا چاہئے تھا، کیونکہ اس سے مجھ کو اپنی قدرت کی حد معلوم ہوتی۔

اور اگر میں یہ بھی فرض کر لوں کہ ہمیشہ سے میں ایسا ہی تھا جیسا کہ اس وقت ہوں، تو بھی ان دلائل کی قوت کم نہیں ہوتی، اور اپنے وجود کے لئے کسی نہ کسی خالق کی ضرورت باقی رہتی ہے کیونکہ میری زندگی کا سارا زمانہ نامتناہی اجزاء میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن میں سے کوئی جز باقی اجزاء پر موقوف نہ ہوگا لہذا یہ



کسی طرح لازم نہیں آتا، کہ جو تکہ میں مقصور می ویر پہلے موجود تھا، اس لئے اس وقت بھی مجھے کو موجود نہ ہونا چاہئے، لہذا آنگہ کوئی ایسی علت یا ہستی موجود ہو، جو اس وقت مجھے کو از سر نو پیدا کرے، اور اسی طرح برابر پیدا کرتی رہے، یعنی میرے استمرار وجود کی ضمانت ہو۔

جو لوگ زمانہ کی حقیقت پر خوب غور کریں گے، ان کو بدائتہ ماننا بڑے گام، کہ کسی جوہر کے وجود کو مستحکم اور ہر لمحہ باقی رکھنے کے لئے، بھی اتنی قوت اور اٹنی عمل کی ضرورت ہے، جو اس کو از سر نو پیدا کرنے کے لئے ہوگی اگر یہ پہلے سے موجود نہ ہو۔ لہذا معلوم ہوا، کہ کسی شے کے خلق کرنے اور اسکے باقی رکھنے میں جو کچھ فرق ہے، وہ محض ہمارے طریق خیال کا دور نہ درحقیقت دونوں ایک ہیں۔

لہذا اب مجھے کو خود اپنی ذات سے صرف یہ سوال کرنا ہے، کہ آیا میرے اندر کوئی ایسی طاقت یا صفت موجود ہے، جس کے ذریعہ سے میں یہ کر سکتا ہوں کہ جو "میں" اس وقت موجود ہے، وہی لمحہ بعد موجود رہ سکے، اس لئے کہ میں جو تکہ محض ایک ذی فکر شے ہوں (یا کم از کم یہ کہ ابھی تک بحث کا تعلق میرے ذی فکر ہونے ہی کی حیثیت سے ہے)، لہذا اگر اس قسم کی کوئی طاقت یا قوت میرے اندر موجود نہ ہوئی، تو یقیناً اس کا شعور بھی مجھ کو ہونا چاہئے تھا، لیکن مجھ کو اس قسم کی کسی شے کا شعور نہیں، لہذا قطعی نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ میں اپنے سے مختلف کسی اور ہستی کا آفریدہ ہوں۔

البتہ یہ کہا جاسکتا ہے، کہ جس ہستی کا میں آفریدہ ہوں، وہ خدا نہیں، بلکہ میرے والدین ہیں، یا کوئی اور علت، جو خدا سے کم کمال ہے۔ لیکن یہ تو ممکن ہی نہیں، کیونکہ جیسا میں اوپر کہہ آیا ہوں، یہ تو بالکل بدیہی بات ہے، کہ علت میں کم از کم اتنی ہی حقیقت پائی جانی چاہئے، جتنی کہ معلول میں پائی جاتی ہے، اور چونکہ میں ایک ایسی ذی فکر یا ذی شعور شے ہوں، جس کے اندر خدا کا شعور یا تصور موجود ہے، لہذا میرے وجود کی جو بھی علت ہو اتنا بہر حال لازمی ہوگا، کہ یہ بھی ذی شعور ہو، اور اس کے اندر تمام ان کمالات کا تصور موجود



ہو، جن سے میں خدا کو متصف خیال کرتا ہوں۔ اب خود اس علت کے متعلق پھر یہی سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ یہ خود اپنی آفریدہ ہے، یا کسی اور شے کی۔ اگر یہ خود اپنی ہی آفریدہ ہے، تو مذکورہ بالا دلائل کی بنیاد پر مانتا پڑے گا کہ یہی خدا ہے، کیونکہ جب یہ موجود بالذات ہے، تو پھر اس کو تمام ان کمالات سے واقف متصف ہونے پر بھی ضرورت قادر ہونا چاہئے۔ جن کے تصورات اس کے اندر موجود ہیں، یعنی جن سے میں خدا کو متصف خیال کرتا ہوں۔ اس لئے کہ اگر اس کا وجود بھی اپنے علاوہ کسی اور علت سے ماخوذ ہو، تو پھر اس علت کی نسبت بھی ہم اسی طرح سوال کریں گے کہ یہ خود آفریدہ ہے، یا کسی اور شے سے پیدا ہوئی ہے، یہاں تک بالآخر ہم کو ایک ایسی علت العلل پر رکتنا پڑے گا، جو خدا ہو۔ کیونکہ یہ سلسلہ لائی نہایت نہیں جاسکتا، اس لئے کہ بحث کا تعلق ہمارے ابتدائی وجود کی علت سے اتنا زیادہ نہیں ہے جتنے کہ حاضری وجود کی بقا اور استمرار سے ہے۔

یہ بھی نہیں فرض کیا جاسکتا ہے، کہ بہت سی علتوں نے مل کر مجھ کو پیدا کیا ہو، جن میں سے ہر ایک سے میں نے ان کمالات کے ایک ایک تصور کو حاصل کیا ہو، جن سے خدا کو متصف کرتا ہوں، اور اس طرح یہ تمام کمالات کائنات کے مختلف اجزاء میں الگ الگ توپائے جاتے ہوں، لیکن صرف کسی ایک ہستی میں جو خدا ہے مل کر نہ پائے جاتے ہوں۔ حالانکہ وحدت، بساطت یا ان تمام چیزوں کا جو خدا میں پائی جاتی ہیں غیر منقطع ہونا، خود ایک ایسا خاص کمال ہے، جس کو میں خدا میں موجود سمجھتا ہوں اور ظاہر ہے، کہ کمالات الہیہ کی اس وحدت کا تصور کوئی ایسی علت میرے اندر نہیں پیدا کر سکتی تھی، جس نے دیگر تمام کمالات کے تصورات بھی نہ پیدا کئے ہوں۔ اس لئے کہ ان کمالات کی وحدت و یکجائی کو یہ علت اس وقت تک میرے لئے قابل فہم نہیں بنا سکتی تھی جب تک کہ ساتھ ہی یہ ان میں سے ہر ایک کو بھی میرے لئے مفہوم و معلوم نہ کر سکتی ہو۔

رہی سب سے آخری صورت یعنی میرے والدین، جو بظاہر میری ولادت کا باعث معلوم ہوتے ہیں، تو گویا ان کے متعلق جو کچھ بھی میں جانتا رہا ہوں، وہ سب درست ہو، تاہم اس سے یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ وہ میرے بقا و استمرار کے بھی باعث ہیں، بلکہ جانتا ہوں کہ میرے ذی فکر ہونے کا تعلق ہے یہ تک نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے مجھ کو پیدا بھی کیا ہے۔ کیونکہ میری ولادت کو جس قدر عقل کا نتیجہ خیال کیا جاتا ہے، اس میں اور جو ہر ذی فکر کی تخلیق میں کوئی مناسبت ہی نہیں معلوم ہوتی۔ میری پیدائش میں زیادہ سے زیادہ ان کو جو کچھ دخل تھا، وہ صرف اسی قدر کہ میں دینی میرا نفس کہہاں اسی کو میں کہتا ہوں، جس مادہ میں داخل یا موجود سمجھا جاتا ہوں، اس میں انھوں نے کچھ رجحانات پیدا کر رکھے ہیں، لہذا ان رجحانات کے متعلق کوئی دشواری نہیں ہو سکتی، لیکن یہ نتیجہ لازماً نکلتا ہے، کہ محض اس واقعہ سے کہ میں موجود ہوں، اور ایک کامل ترین مہیاد یعنی خدا کا تصور میرے اندر پایا جاتا ہے،

خدا کا وجود بدائتہ ثابت ہو جاتا ہے۔ اور اب میرے لئے صرف یہ تحقیق کرنا باقی رہ جاتا ہے، کہ آخر خدا کا یہ تصور پھر میں نے کس طرح سے حاصل کیا ہے۔ کیونکہ میں نے جو اس سے تو اس کو حاصل نہیں کیا، اور نہ اس کا کبھی خلاف تو میرے لئے احضار ہوا، جیسا کہ حسی چیزوں کے تصورات میں ہوتا ہے، جبکہ یہ چیزیں میرے خارجی آلات حس کے سامنے موجود ہوتی یا موجود معلوم ہوتی ہیں۔ نیز یہ تصور محض میرے ذہن یا مستحیلہ کی پیداوار بھی نہیں۔ کیونکہ میں اسے اندر اس میں کسی حذف و اضافہ کی قدرت نہیں پاتا۔ لہذا صرف یہی صورت رہ جاتی ہے، کہ یہ تصور خود میری ذات کے تصور کی طرح میری پیدائش کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا یعنی یہ ایک حقیقی یا حضور کی تصور ہے۔ اور دراصل یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں، کہ خدا نے مجھ کو

پیدا کرتے وقت اس تصور کو میرے اندر قائم کر دیا ہو جس طرح کوئی صنایع اپنی  
صنعت میں نشانی یا علامت بنا دیتا ہے۔ تیسرا اس نشانی کا خود صنعت سے مختلف  
ہونا چاہی ضروری نہیں ہوتا۔ اب خود اسی واقعہ کی بنا پر کہ خدا نے مجھ کو پیدا کیا،  
یہ بات مستحکم ہے، اغلب اور قریب قیاس معلوم ہوتی ہے، کہ اس نے یہ  
نہ کچھ مجھ کو اپنی صورت میں پیدا کیا ہو گا، اور اس صورت یا شکل کا (جس میں کہ  
خدا کا تصور شامل ہے) علم کچھ کہ اچھی قوت سے ذریعہ سمجھتا ہوتا ہے، جس سے  
خود اپنی ذات کا کچھ یعنی جسم میں اپنی ذات پر غور کرتا ہوں تو مجھ کو صرف اسی کا  
بہت نہیں چلتا، کہ میں ایک ایسی ناقص و نامکمل، دوسرے کی محتاج ہستی ہوں،  
جو ہمیشہ اپنے سے بہتر و اعلیٰ کی طرف بڑھنے کی تمنا اور جدوجہد کرتی رہتی ہے،  
بلکہ ساتھ ہی یہ بھی جانتا ہوں، کہ جس کا میں محتاج ہوں، اس کے اندر تمام وہ  
اعلیٰ و بہتر چیزیں موجود ہیں، جن کا میں مستثنیٰ ہوں، اور جن کے تصورات اپنے  
اندیشہ یا تاہوں۔ یہ نہیں کہ یہ چیزیں اس کے اندر محض بالقوہ موجود ہیں، بلکہ  
واقعا و بالفعل پائی جاتی ہیں، اور اس لئے وہ خدا ہے۔ خدا کے ثبوت میں  
جو دلیل میں سے دی ہے، اس کی ساری قوت اس میں ہے، کہ اگر وہ  
خدا واقعا موجود نہ ہوتا، جس کا میرے اندر تصور موجود ہے، یعنی جو نام ان  
اعلیٰ کمالات کا مالک ہے، جن کا ذکر کما حقہ اعلاہ کے بغیر کچھ بھی ہمارا ذہن  
تصور کر سکتا ہے، اور جو ہر قسم کے نقص و بے کمالی سے منزہ ہے، تو یہ ہر  
میں وہ نہ ہو سکتا جو ہوں، یعنی خدا کا یہ تصور میرے اندر ہرگز نہ پایا جاسکتا۔  
لہذا صاف نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ خدا فریبی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ فریب ہمیشہ  
کسی نہ کسی نقص ہی پر مبنی ہوتا ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ میں اس کی مزید تحقیق کروں، اور جو دیگر نتائج  
اس سے نکلتے ہیں، ان پر توجہ کروں، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ذرا  
خود اس ذات خداوندی کا مراقبہ کروں، اس کی حیرت انگیز صفات پر نظر کروں،  
اور اس قدر مطلق کے ناقابل بیان حسن کا ادھیان کروں، اس کی پرستش کروں  
محروکوں، کم از کم اس حد تک جہانگیر کہ میری نگاہ و ذہن کام دے سکے

جو اس کے سامنے چکا چوندا ہے۔  
 کیونکہ جس طرح ہمارے دین نے ہم کو بتلایا ہے، کہ دوسری زندگی  
 کی صلاح و مسرت کا مدار تمام تر جلال خداوندی کے مراقبہ ہی پر ہے، اسی  
 طرح دیکھو کہ کیا اس زندگی کی بھی سب سے بڑی راحت و آسودگی کا  
 سرچشمہ ہی مراقبہ و تفکر نہیں ہے، خواہ وہاں کے مراقبہ کے مقابلہ میں یہ  
 کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو۔

---

# تفکر چہار

## صحیح اور غلط

پہلے چند دنوں میں میں نے اپنے ذہن کو اس سے منقطع و مجرّد رکھنے کی بخوبی عادت ڈال لی ہے، اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ جسم کے متعلق مشکل ہی سے ہم کچھ جانتے ہیں، بلکہ اس کے مقابلہ میں نفس یا ذہن کے متعلق بہت زیادہ اور خدا کے متعلق ان دونوں سے زیادہ جانتے ہیں، لہذا اب محسوسات سے قطع نظر کر کے ذہن یا فکر کو ایسی چیزوں پر لگانا آسان ہو گا جو مادہ سے تمام تر منزہ اور خالص عقلی ہیں۔

انسان کے ذہن یا نفس کا جو تصور مجھ کو اس حیثیت سے حاصل ہے کہ یہ ایک ذی فکر شے ہے، جس میں نہ طول و عرض و عمق کوئی بعد یا امتداد پایا جاتا ہے، اور نہ جسم و جسمانیّت کی کوئی اور چیز اس میں شریک ہے، وہ یقیناً کسی جسمانی چیز کے تصور سے بدرجہا زیادہ صاف و واضح ہے۔ نیز جب اس امر کا خیال کرتا ہوں کہ میں خاک کرتا ہوں، یعنی ایک ناقص و محتاج ہستی ہوں، تو ایک کامل و غنی ذات یعنی خدا کا تصور اس درجہ وضاحت و صفائی کے ساتھ میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور محض اس بنا پر کہ یہ تصور



میرے اندر یہ پایاں دھس کے اندر یہ تصور پایا جاتا ہے، اہموں یا موجود  
ہوں، لازمی و قطعی نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ خدا موجود ہے، اور میرا وجود اپنی زندگی  
کے ہر لمحہ میں اسی کا محتاج ہے، یہ نتیجہ اتنا بدیہی ہے، کہ انسانی ذہن کھیلے  
اس سے زیادہ بدیہی و یقینی چیز خیال میں نہیں آسکتی۔ اس طرح مجھ کو ایک  
ایسا راستہ مل جاتا ہے، جو حق تعالیٰ جس کے اندر علم و حکمت کے سائے خزانے بھرے  
ہیں، اس کے تصور سے کائنات کی دیگر اشیاء تک پہنچا دے گا اس لئے کہ سب سے  
پہلی بات مجھ کو یہ ماننا پڑتی ہے، کہ خدا کے لئے یہ ناممکن ہے، کہ مجھ کو دھوکا دے  
کیونکہ دھوکا اور فریب خواہ کسی قسم کا ہو بہر حال ایک نقص یا بے کمالی ہے،  
اور گویا ہر دھوکا دے سکتا قدرت یا ہشیاری کی ایک علامت معلوم ہوتی  
ہے، تاہم اس کا ارادہ کمزوری و بدینتی کی کھلی شہادت ہے۔ لہذا دھوکا  
دینا خدا کی شان نہیں ہو سکتی۔

دوسری بات یہ ہے، کہ میں اپنے ذاتی تجربہ سے جانتا ہوں، کہ  
میرے اندر حکم لگانے یا صحیح کو غلط سے تمیز کرنے کی ایک خاص قوت پائی جاتی ہے،  
جو ظاہر ہے، کہ دیگر قوتوں کی طرح مجھ کو خدا ہی سے ملی ہے۔ اور چونکہ یہ ناممکن  
ہے، کہ خدا مجھ کو دھوکا دینے کا ارادہ کرے، اس لئے یہ بھی قطعی ہے، کہ  
اس نے یہ قوت ایسی ہرگز نہ بنائی ہوگی، کہ اگر میں اس کا ٹھیک استعمال کروں  
تو گمراہ ہوں۔

یہ بات بالکل صاف تھی، اگر اس سے یہ لازم نہ آتا، تو پھر مجھ کو  
کبھی کسی بات میں دھوکا ہونا ہی نہ چاہئے اس لئے کہ میرے اندر جو کچھ بھی ہے،  
اگر وہ سب خدا ہی کی طرف سے ہے، اور اس نے گمراہ ہونے یا دھوکا  
کھانے کی کوئی صلاحیت میرے اندر نہیں رکھی ہے، تو اس سے لازمی  
نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ مجھ کو کبھی بھی گمراہی و فریب میں نہ مبتلا ہونا چاہئے غرض  
اس طرح جب میں اپنے کو صرف اس حیثیت سے دیکھتا ہوں، کہ خدا کا افریدہ  
ہوں، اور تمام نرا اسی کو پیش نظر رکھتا ہوں، تو مجھ کو اپنے اندر غلطی یا گمراہی  
میں پڑنے کی قطعاً کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ لیکن جب میں اپنی طرف دیکھتا

ہوں، تو تجربہ بتلاتا ہے، کہ دن رات بے شمار غلطیاں کرتا رہتا ہوں۔  
 لہذا اب ان غلطیوں کی علت پر جو غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے، کہ میرے  
 ذہن میں صرف خدا یا ایک ہر ایا کمال ہستی ہی کا ایجابی تصور ہی نہیں ہے، بلکہ  
 کھٹا چاہیے، کہ لاشعریٰ ایک ایسی چیز کا بھی تصور جنہی موجود ہے، جو ہر طرح  
 کے کمال سے بے انتہاء دور یا قطعاً خالی ہے۔ اور میں کہہ چکا ہوں کہ خدا اور اس لاشعریٰ کے  
 بیچ بیچ میں ہوں، بالفاظ دیگر جو مطلق اور عدم مطلق کے درمیان ابھی طرح  
 واضح ہوں، کہ جہاں تک اس کا تعلق ہے، کہ خدا کا افریدہ ہوں، مجھ کو اپنے  
 اندر قطعاً کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جو غلطی کا باعث ہو، لیکن اگر اس حیثیت  
 سے اپنے کو دیکھوں کہ میں کچھ نہ کچھ لاشعریٰ یا ہستی کا بھی شریک ہوں، یعنی میں  
 خود خدا یا ہستی پر نثر نہیں ہوں، بلکہ میرے اندر بہت سی کمیاں ہیں، تو پھر  
 میں بے شمار غلطیوں میں مبتلا ہو سکتا ہوں اور میرا دھوکا کھانا کوئی تعجب کی  
 بات نہیں رہتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ غلطی جو نہ کوئی حقیقی یا کمالی شے نہیں، جو خدا کی  
 محتاج ہو، بلکہ محض ایک نقص ہے، لہذا اس میں مبتلا ہونے کے لئے اسکی  
 ضرورت نہیں، کہ خدا نے کوئی خاص قوت دی ہو، بلکہ اس کی وجہ محض یہ  
 ہو سکتی ہے، کہ خدا نے صحیح کو غلط سے تمیز کرنے کی جو قوت عطا کی ہے،  
 وہ غیر محدود نہ ہو۔

لیکن یہ تو جیہ ابھی پوری طرح تشفی بخش نہیں ہے، اس لئے کہ غلطی  
 خالص نفی، یعنی محض نقص یا ایسے کمال کی کمی کا نام نہیں ہے، جس کو مجھ سے  
 کوئی تعلق نہ ہو، بلکہ یہ نام ہے ایسے علم کے سلب یا کمی کا، جو میرے لئے  
 ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لہذا اب اگر خدا کی ذات کا لحاظ کیا جائے، تو  
 یہ ناممکن نظر آتا ہے، کہ اس نے میرے اندر ایسی قوت رکھی ہو، جو مجھے  
 خود کمال نہ ہو، یعنی ایک ایسے کمال سے خالی ہو جو اس میں ہونا چاہئے  
 تھا کیونکہ اگر یہ صحیح ہے، کہ جس قدر صنائع باہر ہوتا ہے، اسی قدر اس کی  
 صفت کمال ہوتی ہے، تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کا ثبات کے ساتھ ہونے

جوشے سدا کی ہو، اس کے تمام اجزاء و کمال نہ ہوں؟ اور ظاہر ہے کہ خدا مجھ کو  
یقیناً ایسا پیدا کر سکتا تھا، کہ میں کبھی وہ نہ ہو گا نہ کھاتا، نہ سانس لیتی یہ بھی  
ہے، کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی شے کا ارادہ کرتا ہے، جو بہترین ہو، تو پھر کیا یہ  
کہا جاسکتا ہے کہ میرے لئے بھی بہتر تھا، کہ وہ میرا کھانے کے قابل  
ہوں، بجائے اس کے کہ اس کے محفوظ رہ سکوں؟

اس پر مزید غور کرنے سے سب سے پہلی جو بات ذہن میں آتی  
ہے، وہ یہ ہے کہ خدا جو کچھ کرتا ہے اگر یہ کچھ سکوں کہ کیوں کرتا ہے، تو یہ  
کوئی حیرت کی بات نہیں، نہ اس کی ہستی میں اس لئے شبہ کرنا چاہئے، کہ  
اس کے علاوہ بہت سی ایسی دوسری چیزیں نظر آتی ہیں، یا اس کے ہونے کی  
نسبت میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ خدا نے ان کو کیوں اور کیسے پیدا کیا۔ اس لئے کہ  
یہ پہلے ہی سے معلوم ہے، کہ میری ذات بے انتہا کمزور و محدود ہے،  
بخلاف اس کے خدا کی ذات خارج از قیاس اور نامحدود و بے پایاں  
ہے، لہذا اب مجھ کو یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی، کہ اس کی  
قدرت میں ایسی ان گنت اور نامتناہی چیزیں ہیں، جن کے علل و اسباب  
میں میرے ذہن کی رسائی نہیں، اور تنہا ہی بات یہ اس میں نہیں  
کرتی ہے، کہ طبعی یا فطری اشیاء میں علل غائیہ کی تلاش بے فائدہ ہے،  
اور خدا کے ناقابل فہم و رسائی مقاصد کی جستجو ایک جاہلانہ بیباکی۔  
ضرر یہ ہے کہ اگر ہم خدا کی کاموں کی حکمت و کمال کو جاننا چاہتے  
ہیں، تو ہم کو کسی ایک مخلوق کو دیگر مخلوقات سے جدا کر کے نہ دیکھنا چاہئے،  
بلکہ سب پر حیثیت مجموعی نظر رکھنی چاہئے اس لئے کہ یہ بالکل ممکن ہے، کہ  
جوشے کسی وجہ سے بجائے ہو، اگر صرف وہی دنیا میں ہو، تو وہ نہایت ہی  
ناقص معلوم ہو، لیکن اسی کو اگر ساری کائنات کے ایک جز کی حیثیت سے  
دیکھا جائے، تو بغایت کامل ثابت ہو سکتی ہے۔ اور چونکہ میں نے ہر جز  
میں شک کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جس کی بناء پر اب تک بحر اپنی اور خدا کی  
ذات کے کسی دوسری چیز کا یقینی علم نہیں حاصل ہوا ہے، تاہم چونکہ ساتھ ہی

خدا کی قدرت کو نامتناہی تسلیم کر چکا ہوں، اس لئے اس کا انکار نہیں  
 کر سکتا کہ اس لئے اور بھی بہت سی چیزیں پیدا کی ہوں گی یا کر سکتا ہے،  
 اور اس طرح میری حیثیت کل کائنات کے ایک جز کی ہوگی۔  
 اس کے بعد اب اپنی ذات پر خزانہ یادہ غور کرنے اور اپنی غلطیوں  
 کو جو کہ صرف وہی میرے اندر نقص و بے کمالی کا پتہ دیتی ہیں، خیال کرنے  
 سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان کی بنیاد و چیزوں کے اجتماع پر ہے، ایک  
 تو میرے اندر علم کی جو قوت یا قابلیت ہے، دوسرے اختیار یا آزادی  
 ارادہ بالفاظ دیگر میری فہم، میرے ارادے کے ساتھ مل کر ان غلطیوں کا  
 باعث ہوتی ہے۔ اس لئے کہ تنہا فہم سے میں کسی چیز کا اثبات کرتا  
 ہوں، نہ انکار، بلکہ اس سے استنباد کے محض ان تصورات کو سمجھتا ہوں،  
 جن پر نفساً یا اثباتاً کوئی حکم لگایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے، کہ فہم اپنے اس  
 صحیح معنی میں کسی غلطی کا نشانہ نہیں ہو سکتی۔ اور اگرچہ دنیا میں ایسی بے شمار  
 چیزیں پائی جاسکتی ہیں، جن کے تصور سے میری فہم خالی ہو، پھر بھی  
 یہ نہیں کہا جاسکتا کہ میری فہم ان تصورات سے اس طرح محروم ہے کہ گویا یہ اسکا  
 حصہ یا لازمہ ہے، بلکہ صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ یہ تصورات میرے اندر نہیں  
 موجود ہیں، کیونکہ یہ کسی دلیل سے نہیں ثابت کیا جاسکتا کہ خدا نے علم کی جو  
 قوت مجھ کو عطا کی ہے، اس سے اعلیٰ و وسیع تر عطا کرنا چاہئے تھی۔ اور  
 خدا کو خواہ میں کتنا ہی باہر و حکیم صنائع کیوں نہ تصور کروں، تاہم اس سے یہ  
 فرض اس پر نہیں قائم ہو جاتا کہ اپنی صنعت میں تمام وہ کمالات بھر دے  
 جن کو بھر سکتا ہے۔ نہ میں یہ شکایت کر سکتا ہوں، کہ خدا نے مجھ کو  
 کافی طور پر کامل و وسیع یا آزاد ارادہ نہیں دیا، کیونکہ درحقیقت مجھ کو اپنا ارادہ  
 اتنا وسیع اور بڑا محسوس ہوتا ہے، کہ اس کی کوئی تحدید ہی نہیں کی جاسکتی۔  
 اور جو بات مجھ کو یہاں بہت زیادہ عجیب معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے، کہ میرے  
 اندر جو اور باقی چیزیں ہیں، ان میں سے کوئی بھی اتنی اعلیٰ و کامل نہیں ہے،  
 جس کے مزید اعلیٰ و کامل تر ہونے کا میں میں طور پر محسوس نہ کر سکتا ہوں۔ مثلاً



اپنی فہمی کو لوں تو دیکھتا ہوں کہ یہ وسیع کم اور محدود ہے اساتھی  
اس سے کہیں زیادہ وسیع بلکہ نامحدود فہم کا تصور مجھ کو حاصل ہے اور محض  
اس بنا پر کہ یہ تصور میرے اندر موجود ہے میں بلا تامل معاملہ فہم کر لیتا  
ہوں کہ یہ نامحدود فہم خدا میں پائی جاتی ہے یہی حال حافظ یا تنکیل وغیرہ کی  
دوسری قوتوں کا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو میرے اندر  
پہنایت ہی حقیر و محدود اور خدا کے اندر نامحدود و نہ نظرائی ہو۔ البتہ صرف  
ارادہ یا اختیار ایک ایسی قوت ہے جس کو میں اپنے اندر بھی اتنا بڑا پاتا  
ہوں کہ اس تر یا وہ بڑے اور وسیع تر ارادہ کا تصور نہیں قائم کر سکتا، لہذا  
ارادہ ہی ایک ایسی شئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مجھ کو خدا کے ساتھ  
کچھ نہ کچھ مماثلت یا مشابہت حاصل ہے، گو خدا کے ارادے اور میرے  
ارادہ کا کوئی مقابلہ نہیں، نہ حکم کے لحاظ سے نہ قدرت کے لحاظ سے،  
جو دونوں ارادہ میں شریک ہیں، اور جن کی بنا پر خدا کا ارادہ کہیں زیادہ قوی  
اور کارگر ہے، نیز اشیاء کے لحاظ سے بھی اس کے ارادہ کا تعلق ناہنجاری چیزوں  
سے ہے تاہم جہاں تک نفس ارادہ کا تعلق ہے، خدا کے ارادہ میں  
کوئی ایسی شے نہیں نظر آتی جو میرے ارادہ سے بڑی ہو، اس لئے کہ  
نفس ارادہ نام ہے، محض اس کا کہ ہم فلاں شے کے کرے یا نہ کرے  
یعنی اس کے انکار یا اقرار کا وہ یا قبول اس کے قابل ہیں۔ بالفاظ دیگر  
یوں کہو کہ ارادہ نام ہے صرف اس امر کا کہ فہم ہمارے سامنے جن  
چیزوں کو پیش کرتی ہے، ان کے انکار یا اقرار، رد یا قبول میں ہم  
اپنے کو کسی بیرونی قوت سے مجبور نہیں پاتے۔ کیونکہ آزاد و مختار ہونے  
کے پر لازمی نہیں کہ وہ مخالف شقوں سے ہم یکساں طور پر بے تعلق ہوں،  
چاہے یہ کہیں، چاہے وہ، بلکہ جس قدر زیادہ میرا رجحان ایک شق کی  
جانب ہو، خواہ اس کے حق و غیر ہونے کی بنا پر یا اس بنا پر کہ خدا  
نے اس کے لئے میرے اندر میلان پیدا کر دیا ہے، اسی قدر زیادہ اس کا  
کرنا ارادہ و اختیار کا ثبوت ہوگا، اور سچ یہ ہے کہ فطری علم اور خدائی



توفیق ہمارے ارادے کو کم کرنے کے بجائے زیادہ کرتی ہے، چنانچہ جس صورت میں کہ کسی وجہ ترجیح کی عدم موجودگی کے سبب ہم کسی ایک شوق کی طرف راغب و مائل نہیں ہوتے، وہ آزاد ارادے کا ادنیٰ ترین درجہ ہوتا ہے اور ارادہ کے کمال کے بجائے علم کے نقص کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے کہ اگر مجھ کو اس امر کا ہمیشہ قطعی علم حاصل ہو جاتا کہ کیا یہ خیر و حق ہے، تو اس میں کبھی کوئی دشواری نہ ہوتی، کہ اس کے متعلق کیا فیصلہ کرنا چاہئے اور کیا حکم لگانا چاہئے، اور اس طرح میں پورا آزاد ہوتا، اور کبھی بے تعلقی نہ ہوتا۔

لہذا معلوم ہوا کہ ارادہ کی قوت جو خدا نے مجھ کو عطا کی ہے، وہ تو بہر حال میری غلطیوں کا باعث نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ یہ فی نفسہ نہایت وسیع اور نہایت کامل ہے، ساتھ ہی فہم بھی ان غلطیوں کی موجب نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ میں جو کچھ بھی سوچتا یا سمجھتا ہوں اسی قوت فہم کے ذریعہ، جو خدا کا عطیہ ہے، لہذا جو کچھ بھی سمجھتا ہوں ٹھیک ہی سمجھتا ہوں اور اس میں غلطی کرنا ممکن ہے آخر تو پھر غلطیوں کا سرچشمہ کیا ہے؟ انکا سرچشمہ محض یہ واقعہ ہے کہ ارادہ چونکہ فہم کی بہ نسبت بہت زیادہ وسیع ہے، اس لئے میں اس کو حد و دو فہم کے اندر نہیں رکھتا، بلکہ ایسی چیزوں تک بڑھا دیتا ہوں، جن کو سمجھتا نہیں، اور چونکہ فی نفسہ ارادہ ان چیزوں سے بے تعلقی ہوتا ہے، لہذا نہایت آسانی سے بہک جاتا ہے، اور حق کی جگہ باطل اور خیر کی جگہ شر میں جا پڑتا ہے۔ پس دھوکے اور گناہ میں مبتلا ہونے کی یہی وجہ ہے۔

مثلاً جب آج کل میں یہ غور کر رہا تھا کہ دنیا میں کوئی شے موجود ہے یا نہیں، تو اس بنا پر کہ میں اس سوال پر غور کر رہا ہوں، خود میرا موجود ہونا تو بہر حال بدیہی و قطعی ہے، یہ ناممکن تھا کہ جس شے کا میں اس طرح بدیہی و قطع طور پر تصور کر رہا ہوں، اس کو صحیح نہ قرار دیتا۔ اس سبب کے لگائے میں کسی خارجی وجہ سے میں مجبور نہیں ہوا، بلکہ محض

اس وجہ سے کہ فہم کی غایت وضاحت نے ارادہ کے رجحان کو نہایت  
 قوی کر دیا، اور جس قدر اس معاملہ میں میری بے تعلقی کم تھی، اسی قدر میرا فہم  
 زیادہ آزادی پر مبنی ہے۔ یہ خلاف اس کے اب نہ صرف مجھ کو اپنے وجود کا  
 علم ہے، بایں معنی کہ میں ایک ذی فکر شئی ہوں، بلکہ جہاں شے کا بھی ایک تصور میرے  
 ذہن میں موجود ہے، جس کے متعلق مجھ کو شبہ ہے، کہ یہ ذی فکر شے کوئی خود  
 میری ذات سے کوئی مختلف چیز ہے، یا دونوں ایک ہی ہیں۔ اور اس  
 بارے میں اب تک مجھ کو کوئی ایسی دلیل نہیں مل سکی ہے، جو میرے اندر ان میں سے  
 ایک خیال کو راجح و متین کر دے۔ لہذا معلوم ہوا کہ میں اس میں نفی و اثبات  
 دونوں سے قطعاً بے تعلق ہوں، بلکہ کوئی حکم ہی نہیں لگا رہا ہوں۔  
 اور یہ بے تعلقی صرف انہیں چیزوں میں نہیں ہوتی جن کا فہم کو سرے  
 سے کوئی علم نہیں ہوتا، بلکہ اصولاً تمام ان چیزوں میں بھی، جن کا ارادہ کے  
 غور و خوض کے وقت کمال وضاحت کے ساتھ علم نہیں حاصل ہوتا اس لئے کہ  
 کوئی حکم لگانے پر جو قیاسات مجھ کو مائل کرتے ہیں، وہ خواہ کتنے ہی اغلب  
 کیوں نہ ہوں، تاہم صرف اتنا جانتا کہ ان کی حیثیت، غیر مشتبہ و قطعی دلائل کی  
 نہیں، بلکہ محض قیاسات کی ہے، ہر جانب مخالفت کے احتمال کے لئے کافی  
 ہے۔ اور ہر محض چند دونوں اس کا مجھ کو اچھی طرح تجربہ ہوتا رہا ہے۔  
 کیونکہ جن چیزوں کو میں پہلے بالکل صحیح مانتا تھا، ان سب کو صرف اس بنا پر  
 غلط فرض کر لیا، کہ جانب مخالفت کا احتمال یا شک کی گنجائش تھی۔  
 اس لئے کہ جو شئی پوری وضاحت و صحت کے ساتھ میری سمجھ  
 میں نہیں آتی ہے، اگر اس پر حکم لگانے سے امتراز کروں، تو ظاہر ہے، کہ  
 یہ بالکل درست ہو گا، اور میں دھوکے میں نہ پڑوں گا۔ لیکن اگر ایسی  
 صورت میں اثبات یا نفی کا کوئی حکم لگا دوں، تو یہ میرے ارادہ یا  
 اختیار کا صحیح استعمال نہ ہو گا۔ کیونکہ اگر یہ حکم واقع کے مطابق نہ پڑا  
 تو صراحتہ میں نے دھوکا کھایا، اور بغرض واقع کے مطابق ہی پڑا، تو  
 بھی یہی اتفاق ہو گا، جو اس الزام سے بہر حال نہ بچا سکے گا، کہ ارادہ کا

استعمال میں لےئے بجا کیا۔ اس لئے کہ قدرت کی روشنی کا افشاں یہ ہے کہ  
فہم کے عالم کو ارادہ کے حکم پر ہمیشہ مقدم ہونا چاہئے۔ اور ارادہ اختیار  
کے اس بجا استعمال میں وہ محرومی مضمر ہے، جس سے عقلی فیصلہ  
ہوتی ہے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں، کہ یہ محرومی اس عمل میں ہوتی ہے،  
جس کا منشاء میری ذات ہے، نہ کہ اس قوت میں جو خدا کا عطیہ ہے۔ نیز  
میرے عمل میں بھی یہ اس حیثیت سے نہیں ہوتی، کہ وہ خدا پر موقوف ہے۔ کیونکہ  
اس شکایت کا مجھ کو قطعی حق نہیں پہنچتا، کہ عقل کی جو قوت اور قدرت کی جو  
روشنی خدا نے عطا کی ہے، اس سے زیادہ کیوں نہیں عطا کی۔ اس لئے کہ  
محرومی عقل یا فہم کی ماہیت ہی یہ ہے کہ وہ بہت سی چیزوں کو نہ سمجھ  
سکتی ہو، اور مخلوق عقل کی ماہیت یہ ہے، کہ وہ محروم ہو۔ خدا پر  
میرا کوئی دعوئی نہ تھا، بھری اس لئے جو کچھ کمالات مجھ کو عنایت فرمائے  
ہیں، ان کا ہر طرح شکر گزار ہونا چاہئے، نہ یہ الٹی زبردستی کہ اس لئے دیگر  
کمالات کیوں نہیں دئے، یا ان سے محروم رکھنا نا انصافی ہے۔  
اس شکایت کا بھی کوئی حق نہیں حاصل کہ اس نے ارادہ فہم سے  
زیادہ وسیع دیدی ہے، کیونکہ ارادہ ایک بسیط اور ناقابل تقسیم شے ہے، مگر  
کلیتہً برباد کئے بغیر اس کا کوئی حصہ اس سے الگ نہیں کیا جاسکتا بلکہ  
یہ ارادہ جتنا زیادہ وسیع ہے اتنا ہی اس کے دینے والے کا مجھ کو اور  
زیادہ شکر گزار ہونا چاہئے۔

اس گلہ کی بھی کوئی وجہ نہیں، کہ خدا میرے ارادہ کے افعال  
یعنی ان احکام میں، جن میں وضو کا کھانا ہوں، میرا ساتھ دیتا ہے، اس لئے  
کہ جہاں تک ان افعال کا خدا کی ذات سے تعلق ہے وہ بالکلیہ حق  
اور قطعاً خیر ہیں۔ اگر خدا نے ان کو کرنے کے قابل مجھ کو کیا ہے تو یہ  
بھی میرے لئے ایک کھمال ہی ہے، بجائے اس کے کہ ان کو نہ  
کر سکتا۔ باقی رہی وہ محرومی جس میں خطا اور گناہ کی علت محرومی مضمر  
ہے، اس میں خدا کو ساتھ دینے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ یہ

کوئی شئی یا وجود نہیں ہے، اور اگر خدا ہی اس کی علت ہے، تو پھر اسکو  
موجود ہی نہیں بلکہ یہ سب کے مفہوم میں صرف سبب کہنا چاہئے یا اسلئے کہ  
یہ درحقیقت خدا کی کوئی بے کمالی نہیں ہے، کہ اس نے مجھ کو بعض ایسی  
چیزوں پر حکم لگائے یا نہ لگائے کی آزادی دے رکھی ہے جن کا میری  
فہم کو صاف و واضح علم نہیں دیا ہے، بلکہ یہ دراصل میرا نقص ہے کہ میں  
اس آزادی کو صحیح طور سے استعمال نہیں کرتا، اور جلد بازی میں ایسی چیزوں پر  
حکم لگا دیتا ہوں، جن کا مجھ کو صرف ایک دھندلا سا یا مبہم علم حاصل ہے۔  
یا جو وہاں تمام باتوں کے پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے، کہ خدا مجھ کو یہ اسانی  
ایسا بنا سکتا تھا، کہ میں دھوکا نہ کھاتا تو میری آزادی بدستور باقی رہتی اور  
میرا علم صحیح و وہی رہتا۔ مثلاً اگر وہ میری فہم کو تمام ایسی چیزوں کا صاف و  
واضح علم عطا کر دیتا، جن پر مجھ کو کبھی بھی حکم لگانا پڑتا، یا صرف یہی کہ میرے  
حفاظت میں اس امر کو اتنا راسخ کر دیتا کہ مجھے کبھی بھول نہ سکتا، کہ جب تک  
کسی شئی کا صاف و واضح تصور نہ حاصل ہو سکے، اس وقت تک اس پر  
میرے حکم نہ لگاؤں گا اور اس میں شک نہیں، کہ جہاں تک میں صرف اپنا  
خیال کرتا ہوں، اس طرح کہ گویا دنیا میں تنہا میں ہی ہوں، تو یہی سمجھتا ہوں  
آتا ہے، کہ اگر خدا مجھ کو ایسا پیدا کر دیتا، کہ مجھے کبھی غلطی نہ کر سکتا، تو اس سے  
بہت زیادہ میں کامل ہوتا، جتنا کہ اب ہوں۔ لیکن ساتھ ہی اس سے بھی  
انکار نہیں ہو سکتا، کہ دنیا کے بعض اجزاء کا نقص سے پاک ہونا اور بعض کا  
نہ ہونا، فی الجملہ اس سے بڑا کمال ہے، کہ سب بالکل ایک ہی طرح کے  
ہوتے۔

اور مجھ کو اس شکایت کا قطعاً حق نہیں حاصل، کہ خدا نے مجھ کو دنیا میں  
پیدا کیا، تو سب سے اعلیٰ و اکمل ہی کیوں نہیں پیدا کیا، بلکہ مجھ کو تو اس پر  
تو تشویش ہو رہا ہے، کہ اگر اس نے ایک بات میں مجھ کو غلطی سے باز نہیں  
رکھا، یعنی تمام ایسی چیزوں کا واضح و پوری علم نہیں دیا، جن پر میں حکم  
لگا سکتا ہوں، تو کم از کم دوسری شئی کو تو میرے اختیار میں چھوڑ دیا ہے،

یعنی اس امر کا قطعی نتیجہ کہ لوں، کہ کبھی ایسی چیزوں پر حکم نہ لگاؤں گا، جن کی صحت یقیناً طور سے نہ معلوم ہو جائے۔ اس لئے کہ گو میرے اندر یہ کمزوری ہے، کہ کسی خیال کو ذہن میں مسلسل قائم نہیں رکھ سکتا، تاہم بار بار کی توجہ سے اس کو حافظہ میں اس قدر ضرور جمالے سکتا ہوں، کہ بوقت ضرورت یاد پڑ جائے، اور اس طرح غلطی سے بچنے کی عادت ہو جاسکتی ہے۔ اور انسان کا سب سے اعلیٰ کمال جو کہ غلطی سے بچنا ہی ہے، لہذا میں سمجھتا ہوں، کہ آج کے فکر سے مجھ کو کم نفع نہیں حاصل ہوا، کہ غلطی اور خطا کی علت معلوم ہو گئی ہے۔

اور اس میں شبہ نہیں رہا، کہ غلطی کی علت پس ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ جب تک میں اپنے ارادہ کو اپنے علم کے حدود میں اس طرح رکھوں کہ جن چیزوں کا صاف و واضح تصور فہم سے نہیں حاصل ہوا ہے، اس پر حکم نہ لگاؤں، اس وقت تک دھوکا کھانا قطعاً نا ممکن ہے۔ کیونکہ یہ صاف و واضح تصور کا کوئی نہ کوئی شئی ہو نا ضروری ہے، لہذا وہ لاشی سے کسی طرح مانع نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا خالق لازماً خدا ہی کو ہونا چاہئے اور خدا جو کہ علی اطلاق کاٹل ہے، اس لئے وہ کسی غلطی کی علت نہیں ہو سکتا، لہذا ہر ایسا تصور لازماً صحیح ہے۔

آج مجھ کو صرف یہی نہیں معلوم ہوا، کہ غلطی سے بچنے کے لئے کس کرنا چاہئے، بلکہ یہ بھی کہ صحیح علم حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ جن چیزوں کا تصور مجھ کو کما حقہ حاصل ہے، اگر ان پر میں اپنی توجہ کو پوری طرح قائم رکھوں، اور جن چیزوں کا تصور و عند صلا نا صاف ہے، ان کے ان کو الگ رکھوں، تو صحیح علم تک پہنچ جانا یقینی ہے، جس کا آئندہ پورا خیال رکھوں گا۔



# تفکرِ ختم

## مادی اشیاء کی ماہیت اور وجود کا ثبوت

خدا کی صفات اور خود میرے یا میرے نفس کی ذات کے متعلق ابھی بہت سی باتیں تحقیق طلب باقی ہیں جن پر امید ہے کہ کسی دوسرے موقع پر بحث ہوگی۔ سر دست (جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ صحیح علم حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا اور کیا نہ کرنا چاہئے) تو مجھے کو غافل طور پر ان شکوک و شبہات سے نکلنے کی کوشش کرنا ہے جن میں اوصاف بھلے و غلط ہیں مبتلا رہا ہوں اور دیکھنا ہے کہ آیا مادی اشیاء کے متعلق ہم کچھ جان سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اس تحقیق سے پہلے کہ مادی اشیاء کی سی کوئی قسمی جھجھ سے باہر موجود ہے، ان اشیاء کے تصورات کی (بہ حیثیت اس کے کہ وہ میرے اندر یا شعور میں موجود ہیں) اور اس امر کی تحقیق کرنی ہے کہ ان میں سے کون واضح اور کون مبہم ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو اس کم کا واضح تصور حاصل ہے جس کو فلاسفہ کم متصل، یا طول و عرض و عمق کے ابعاد ثلثہ سے تعبیر کرتے ہیں

ہیں، جو اس کم میں یا اس شے میں جو اس کم سے متصف ہونے سے جانتے ہیں۔  
 نیز اس کم کے مختلف اجزاء شمار کیے جاسکتے ہیں، اور ہر جز کو ہر طرح سے  
 قدر و قیامت، اشکال و اوضاع اور حرکات سے متصف کر سکتا ہوں۔ اور  
 ہر حرکت کو ہر قسم کے مراتب و درجے سے نسبت دے سکتا ہوں، یہی  
 نہیں کہ ان چیزوں کو اس طرح صرف کلی حقیقت سے میں وضاحت کیساتھ  
 جانتا ہوں، بلکہ ادنیٰ تا جہ سے، اشکال، اعداد، حرکات وغیرہ کے ایسے  
 شمار و جزئی خصوصیات متکشف ہوتے ہیں جن کی صحت و صداقت الہی بدیہی  
 اور میری فطرت کے ایسے موافق ہوتی ہے، کہ جب ان کو جانتا شروع کرتا  
 ہوں، تو یہ نہیں معلوم ہوتا، کہ کوئی نئی چیز جان رہا ہوں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا  
 ہے، کہ پہلے سے جانتی ہوئی چیزیں محض یاد آ رہی ہیں، گو ان کی طرف اب تک  
 میں نئے التفات نہیں کیا تھا۔

اور جو بات مجھ کو سب سے زیادہ اہم یہاں معلوم ہوتی ہے،  
 وہ یہ ہے، کہ بعض چیزوں کے ایسے بے شمار تصور یا اپنے اندر پاتا  
 ہوں، جن کو لاشعری محض کسی طرح نہیں خیال کیا جاسکتا، خواہ ان کا وجود میرے  
 ذہن سے باہر نہ ہو، نیز ان کو میں گڑبٹ یا اپنے ذہن کا اختراع بھی نہیں  
 قرار دے سکتا، چاہے ان کا خیال کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار میں ہو،  
 مگر یہ خود اپنی قائم و غیر متغیر ماہیت پر مشتمل ہیں۔ مثلاً مثلث کو لو، کہ گو میرے  
 ذہن سے باہر یہ شکل دنیا کے کسی حصہ میں نہ نکلا، اس وقت باجائی ہے، کبھی پہلے  
 پائی گئی ہے، تاہم یہ ایک ایسی ماہیت یا حقیقت پر مشتمل ہے، جو ازلی و  
 غیر متغیر ہے، اور جو نہ میرے ذہن پر موقوف ہے، نہ اس ذہن کی ایجاد  
 اختراع ہے۔ جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے، کہ مثلاً تین زاویوں کا دو  
 قائموں کے مساوی ہونا یا سب سے بڑے زاویہ کا سب سے بڑے  
 ضلع کے مساوی ہونا اور اسی طرح کے مثلث کے بہت سے ایسے مختلف  
 خواص ہیں، جن کا مثلث میں پایا جاتا میرے چاہنے نہ جانے پر موقوف  
 نہیں، بلکہ مثلث کے پہلے پہل تصور میں ان چیزوں کا خیال تک نہ آیا

ہو گا، لہذا ان کو میری اختراع یا ایجاد کسی طرح نہیں کہا جاسکتا۔  
 یہ اعتراض بھی نہیں ہو سکتا، کہ مثلث کا تصور میرے ذہن میں  
 شکل کی چیزیں دیکھ کر جو اس کے واسطے سے پیدا ہوئے۔ اس لئے کہ  
 مثلث کے علاوہ میں اپنے ذہن میں بے شمار ایسی اشکال کا تصور قائم  
 کر سکتا ہوں جن کے متعلق ادنیٰ شبہ بھی نہیں ہو سکتا، کہ کبھی بھی جو اس کے  
 واسطے سے ان کا علم ہوا ہے، پھر بھی ان کے مختلف خواص کا اسی طرح  
 اثبات کرتا ہوں، جیسا کہ مثلث کے خواص کا۔ اور یہ خواص سب کی  
 سب صحیح ہیں، اس لئے کہ ان کا واضح طور پر تصور کرتا ہوں، لہذا یہ  
 محض لاشی نہیں بلکہ کوئی شئی ہیں۔ کیونکہ یہ بالکل بدیہی بات ہے، کہ  
 جو شئی صحیح ہے، وہ کوئی شئی ضرور ہے، صحت یا صداقت بعینہ وجود ہی  
 ہے۔ اور یہ میں اوپر پھلے ہی اچھی طرح ثابت کر آیا ہوں کہ جن چیزوں کو  
 میں واضح و صاف طور سے جانتا ہوں، وہ صحیح ہیں۔ اور گویں لئے اسکو  
 برہان سے ثابت نہیں کیا تھا، تاہم میرے ذہن کی نوعیت ہی ایسی ہے،  
 کہ جب تک صاف و واضح طور پر ان کا تصور کرتا ہوں، ان کو صحیح سمجھنے پر  
 مجبور ہوں حتیٰ کہ مجھ کو یاد ہے کہ جب محسوسات کا میں پوری طرح قائل  
 تھا، اس وقت بھی، سب سے بڑی صداقتوں میں ہیں انہیں چیزوں کو  
 شمار کرتا تھا، جن کا اشکال و اعداد وغیرہ سے متعلق واضح و صاف تصور  
 حاصل تھا، یعنی جن کا تعلق علم حساب یا ہندسہ تھا۔  
 اب اگر محض اس بنا پر کہ میں اپنے ذہن سے کسی شئی کا تصور اندر  
 کر سکتا ہوں، یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ اس شئی کی نسبت جو کچھ وضاحت و صفا  
 کیساتھ میں سمجھتا ہوں، وہ واقعا اس میں موجود ہے، تو کیا اس سے وجود  
 خدا کی ایک دلیل اور برہانی ثبوت کا استنباط میں نہیں کر سکتا؟ یہ تو بالکل  
 یقینی ہے کہ خدا یعنی ایک کامل و برتر شئی کا تصور میرے اندر کسی شکل یا عدد  
 کے تصور سے کم نہیں ہے۔ اور جس وضاحت کے ساتھ میں یہ سمجھتا ہوں  
 کہ کسی شکل یا عدد کے متعلق جو کچھ میں ثابت کرتا ہوں وہ اسی شکل یا عدد کا

حقیقت و ذات میں واقعا داخل ہے، اس سے کم وضاحت و صفائی  
کیساتھ ہیں یہ نہیں سمجھتا کہ ایک واقعی و ازلی وجود خدا کی ذات یا حقیقت  
میں داخل ہے۔ لہذا گزشتہ تفکرات میں جن نتائج تک میں پہنچا ہوں،  
اگر وہ سارے کے سارے غلط بھی ہوں، تو بھی خدا کا وجود ہمیشہ  
لئے کم از کم اتنا ہی یقینی رہتا ہے جتنا کہ اب تک ریاضیات کی صداقتوں  
کو میں سمجھتا آیا ہوں، جن کا تحقق صرف اشکال و اعداد سے ہے، گو اول  
نظر یہ میں یہ خیال درست نہیں نظر آتا، بلکہ محض سفسطہ معلوم ہوتا ہے چونکہ  
ہر شے کے اندر اس کی ذات اور اس کے وجود میں تفریق و تمیز کی عادت  
ہو گئی ہے، اس لئے آسانی کے ساتھ ذہن میں آجاتا ہے، کہ خدا کے  
وجود کو اس کی ذات سے جدا کیا جاسکتا ہے، اور اس طرح خدا کا تصور  
بغیر اس کے واقعی وجود کے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مزید غور و توجہ سے معلوم  
ہوتا ہے، کہ خدا کے وجود کو اس کی ذات سے منفک کرنا اس سے زیادہ  
ممکن نہیں ہے، جتنا کہ مستقیم الاضلاع مثلث کی ذات سے اس بات کا  
کہ اس کے تین زاوے دو قائموں کے برابر ہوئے ہیں، یا پہاڑ کے تقوے  
وادی کے تصور کا۔ لہذا خدا یعنی تمام کمالات کی جامع ہستی کا بغیر وجود  
یعنی ایک کمال سے قطع نظر کر کے تصور کرنا اس سے کم متناقض یا استحال  
نہیں ہے، جتنا کہ کسی پہاڑ کا بغیر وادی کے تصور کرنا۔

گو یہ سچ ہے، کہ میں خدا کا بغیر وجود کے اس سے زیادہ تحلیل  
نہیں کر سکتا ہوں، جتنا کہ پہاڑ کا بغیر وادی کے، تاہم جس طرح میں اس  
پہاڑ پر کہ میں پہاڑ کا خیال وادی کے ساتھ کرتا ہوں، یہ لازم نہیں آتا، کہ  
دنیا میں واقعا کوئی پہاڑ موجود بھی ہے، اسی طرح یہ بھی لازم نہیں آتا، کہ  
خدا واقعا موجود ہے کیونکہ میرے خیال سے اس پہاڑ پر کوئی موجب  
عائد نہیں ہو جاتا۔ اور جس طرح میں پہاڑ کو ٹکڑے کا تحلیل کر سکتا  
ہوں، کوئی نفسہ ایسا گھوڑا نہ پایا جاتا ہو، اسی طرح خدا کو موجود ہی خیال  
کر سکتا ہوں، کوئی نفسہ وہ موجود نہ ہو۔

لیکن ان دو لوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اس اعتراض کی  
 میں محض سقط ہے۔ اس لئے کہ اگر میں پہاڑ کا وادی کے بغیر خیال نہیں  
 کر سکتا، تو اس سے یہ نہیں لازم آتا، کہ دنیا میں کوئی پہاڑ موجود بھی ہے  
 بلکہ محض یہ کہ پہاڑ اور وادی ایک دوسرے سے ناقابل التفکک ہیں،  
 خواہ موجود ہوں یا نہ ہوں۔ بخلاف اس کے خدا کا خیال بغیر وجود کے نہ  
 کر سکتے ہی سے یہ لازم آجاتا ہے، کہ وجود کو خدا سے منفک نہیں کیا جاسکتا  
 لہذا خدا و افعال موجود ہیں۔ یہ نہیں کہ وجود میرے خیال پر مبنی ہے، یا خیال  
 اشیاء پر کوئی وجوب عائد کرتا ہے، بلکہ اس کے برعکس وجوب جو  
 خود شئی میں پایا گیا ہے، اسی پر میرا خیال مبنی ہے، اس لئے خدا کا بغیر  
 وجود کے یعنی ایک کامل مبنی برتر کا بغیر ایک کمال برتر کے خیال کرنا میرے  
 اختیار میں نہیں، جس طرح کھوڑے کا پر دار یا بے پر خیال کرنا میرے  
 اختیار میں ہے۔

یہ کہنا بھی درست نہ ہو گا، کہ جب خدا کو پہلے تمام کمالات کا  
 جامع فرض کر لیا، تو آپ سے آپ اس کو موجود بھی ماننا پڑے گا، اس لئے کہ  
 وجود خود ایک کمال ہے۔ لیکن پہلا فرض ہی اس سے زیادہ ضروری نہ  
 تھا، جتنا مثلاً یہ فرض کر لیا جائے کہ تمام چار اضلاعی اشکال دائرہ کے اندر  
 بنائی جاسکتی ہیں، حالانکہ اگر ایک مرتبہ ایسا فرض کر لیا جائے، تو پھر آپ  
 آپ یہ بھی ماننا پڑے گا، کہ شکل معین بھی دائرہ کے اندر بنائی جاسکتی ہے  
 کیونکہ یہ بھی چار اضلاعی ہے، اور اس طرح میں ایک غلط شئی کے ماننے پر  
 مجبور ہو جاؤں گا۔ لیکن یہ اعتراض، جیسا کہ میں نے کہا، درست نہیں۔  
 اس لئے کہ گو یہ ضروری نہیں، کہ میں خدا کا بھی خیال کروں، تاہم جب  
 کبھی بھی احمقین و برترین ہستی کا خیال مجھ کو آئے، اور اس کے تصور کو  
 اپنے خزانہ ذہن سے نکالوں، تو اسی وقت اس کو ہر طرح کے کمال سے  
 متصف سمجھنا ضروری ہو گا، اگرچہ ان تمام کمالات کا احصاء پایا نہیں ہے  
 ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ ہیں تو مجھ نہ کروں اور یہ ضرورت یا وجوب وجود کو



کہا اس کے لئے کہ بعد اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ  
 یہ اولین و برترین مسئلہ موجود ہے جس طرح یہ تو میرے لئے ضروری نہیں  
 کہ مشابہت کا کبھی خیال کروں، لیکن اگر کبھی تین زاویوں سے بنی ہوئی مستقیم  
 الاشکال شکل کا خیال کروں، تو یہ قطعاً ضروری ہو گا، کہ ساتھ ہی اس کو تمام  
 ان چیزوں سے متصف ہوں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ اسکے  
 میں زیادہ سے دو قانچوں سے بڑے نہیں ہیں، خواہ اس واقعہ کی طرف  
 میری کوئی خاص توجہ نہ ہو۔ بخلاف اس کے جب میں یہ دیکھتا ہوں، کہ  
 کون کون سی اشکال دائرہ کے اندر بنائی جاسکتی ہیں، تو یہ خیال کرنا کسی  
 طرح بھی ضروری نہیں ہوتا، کہ تمام چار اشکال اس کے اندر بنائی  
 جاسکتی ہیں، بلکہ جب تک میں اپنے ذہن میں صرف انہیں چیزوں کو  
 جگہ دینا چاہتا ہوں، جن کا واضح و صاف طور پر تصور کر سکتا ہوں، اس  
 وقت تک تو ایسا فرض بھی نہیں کر سکتا۔ لہذا اس قسم کے غلط مفروضات  
 اور ان صحیح تصورات میں زمین آسمان کا فرق ہے، جو میرے ساتھ  
 پیدا ہوئے ہیں، جن میں سب سے مقدم و اعلیٰ خدا کا تصور ہے۔  
 اس لئے کہ میرے پاس یہ سمجھنے کے بہت سے وجوہ ہیں، کہ  
 خدا کا تصور، میرا من گڑبست یا مفروضہ نہیں ہے جو میرے خیال کے  
 ناسخ ہو، بلکہ یہ ایک حقیقی اور تغیرات سے منزہ ذات کا نمائندہ تصور  
 ہے۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے، کہ خدا کے سوا میں کسی اور ایسی شئی کا  
 خیال ہی نہیں کر سکتا، جس کا وجود اس کی حقیقت میں وجوداً و فعلیہ ہو،  
 و دوسرے وجہ یہ کہ اس طرح کے دو یا دو سے زیادہ خداؤں کا تخیل کرنا ناممکن  
 ہے، اور چونکہ یہ فرض کیا جا چکا ہے، کہ ایک خدا اس طرح کا موجود  
 ہے، لہذا واضح و لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ وہ ازل سے موجود ہے،  
 اور اب تک موجود رہے گا، سب سے آخر یہ کہ میں خدا میں اور  
 بہت سی ایسی صفات کا اور اک کرتا ہوں، جن میں نہ کوئی تغیر  
 کر سکتا ہوں اور نہ کمی۔

باقی جس ثبوت و دلیل سے بھی میں کام لوں، بالآخر اسی نقطہ پر واپس  
آنا پڑے گا، کہ کمال یقین صرف وہی چیزیں پیدا کر سکتی ہیں، جن کو میں  
واضح و صاف طور پر تصور کرتا ہوں۔ اور گو ان چیزوں میں سے کچھ ایسی  
ہیں جن کو ہر شخص براہینہ جانتا ہے، لیکن کچھ ایسی بھی ہو سکتی ہیں، جن کا  
علم صرف ان لوگوں کو ہوتا ہے، جو ان پر زیادہ غور و غور کر رہے ہیں،  
تاہم جب ایک مرتبہ علم ہو گیا، تو پھر یہ اتنی ہی یقینی خیال لگاتی ہیں،  
جتنی کہ پہلی۔ مثلاً قیاسی حکم الزامیہ بمثلث کو لوازل میں فوراً ہی جس طرح یہ  
واضح طور پر نظر آجاتا ہے، کہ قاعدہ کے مقابلہ والا زاویہ سب سے  
بڑا ہے، اسی طرح اول نظر میں یہ معلوم نہیں ہوتا، کہ اس قاعدہ کا مربع  
باقی دو زوئوں اضلاع کے مربع کے مساوی ہے، لیکن جب ایک مرتبہ  
اس کو سمجھ لیا جاتا ہے، تو پھر اس کی صداقت کا بھی ہم کو ویسا ہی کمال  
یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ اور خدا کا تو یہ حال ہے، اگرچہ اس کے تقصبات کا  
میرے ذہن پر پہلے سے قبضہ نہ ہوتا، اور محسوسات نے ہر طرف سے  
میرے خیالات کو گھیر لیا ہوتا، تو سب سے پہلے اور سب سے  
آسانی کے ساتھ خدا ہی کا وجود میری سمجھ میں آتا۔ اس لئے کہ دنیا میں  
کیا اس خیال سے بھی زیادہ کوئی شئی بجائے خود واضح و بدیہی ہے، کہ  
خدا یعنی ایسی کمال و برتر ہستی پائی جاتی ہے جس کا خود تصور ہی اس کے  
ازلی یا وجودی وجود کو مستلزم ہے، لہذا وہ موجود ہے۔  
اور گو اس صداقت کو ابھی طرح سمجھنے کے لئے مجھ کو بے حد  
دماغی کاوش سے کام لینا پڑا ہے، تاہم اب یہ صداقت نہ صرف  
یقینی چیزوں سے بڑھ کر یقینی معلوم ہوتی ہے، بلکہ میرا دعویٰ ہے، کہ  
تمام دوسری چیزوں کا یقیناً اس پر اس طرح کلیتہً موقوف ہے، کہ اس کو  
جاننے بغیر کسی چیز کا پوری طرح جاننا قطعاً ناممکن ہے۔  
کیونکہ میری فطرت اگرچہ ایسی واقع ہوتی ہے، کہ جہاں میں نے  
کسی شئی کو بالکل صاف و واضح طور سے سمجھ لیا، تو پھر اس کو سچ یقین

کرنے سے اپنے کو باز نہیں رکھ سکتا، تاہم چونکہ اس فطرت میں یہ بھی داخل ہے، کہ ایک شئی پر اپنے ذہن کو مسلسل نہیں جمائے رہ سکتا، اور ایسا ہوتا ہے، کہ بار بار ایک شئی جس کے سچ ہونے کا میں فیصلہ کر چکا ہوں بعد کو جب اس کا خیال اس فیصلہ کے وجود و دلائل کے بغیر آتا ہے، تو اس درمیان میں ایسے دلائل ذہن میں آسکتے ہیں کہ اگر میں خدا کا قائل نہ ہوں، تو میری رائے کو آسانی سے بدل سکتے ہیں، اور اس طرح بجز مبہم و متزلزل رایوں میں پھر پھر آنے کے کسی شئی کا قطعی و حقیقی علم سرے سے بھی حاصل ہی نہ ہوتا۔

مثلاً جب میں مثلث کی اہمیت پر غور کرتا ہوں تو میں جس کو ہندسہ میں کچھ دخل ہے، قطعیت کے ساتھ جانتا ہوں، کہ اس کے تین زاوے دو قائموں کے برابر ہیں، اور جب تک اس کی دلیل میرے خیال میں ہے، اس کو نہ ماننا ناممکن ہے، لیکن جہاں یہ دلیل ذہن سے اتری، تو گواہی دہو کہ میں نے اس کو واضح طور پر سمجھ لیا تھا، تاہم اگر خدا کے وجود کا مجھے کو علم نہیں، تو اس کی صداقت میں آسانی کے ساتھ شبہ پیدا ہو جاسکتا ہے۔ کیونکہ میری سمجھ میں یہ آسکتا ہے، کہ فطرۃ میں ایسا بنا یا گیا ہوں، کہ ان چیزوں میں بھی آسانی سے دھوکا کھا سکتا ہوں، جن کو اپنے نزدیک انتہائی وضاحت و قطعیت کے ساتھ جان رہا ہوں، خصوصاً جب یہ معلوم ہے، کہ بھیری چیزیں جن کو میں قطعی و صحیح شمار کرتا تھا اکثر ایسا ہوا، کہ بعد کو دوسرے دلائل نے ان کو قطعاً غلط سمجھنے پر مجبور کر دیا۔

لیکن جب ہم نے یہ معلوم کر لیا، کہ خدا موجود ہے، ساتھ ہی ہر شئی اس پر مبنی و موقوف ہے، اور وہ دھوکا دینے والا نہیں ہے، تو لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ جو کچھ صاف و واضح طور پر میں اور اس کرتا ہوں، وہ ضرور سچ ہے۔ گو اس کے صحیح ہونے کے دلائل کسی وقت میرے سامنے نہ ہوں، تاہم اگر مجھ کو اتنا یاد ہے، کہ پہلے

ہیں اس کو پوری وضاحت و صحت کے ساتھ سمجھ چکا ہوں، تو اس کے خلاف اب کوئی ایسی دلیل نہیں لائی جاسکتی، جو میرے اندر اس کی نسبت شک پیدا کر سکے۔ اور اس طرح مجھ کو اس کا قطعی و صحیح علم حاصل ہو جاتا ہے، اور یہی علم ہندسہ و غیرہ کی سی تمام ایسی چیزوں پر حاوی ہے، جن کے متعلق مجھ کو یاد ہے، کہ پہلے ثابت ہو چکی ہیں۔ اس لئے کہ اب میرے لئے ان میں شبہ کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ کیا یہ ہو سکتی ہے، کہ میری فطرت ایسی ہے، کہ آسانی سے دھوکا کھا سکتی ہو؟ لیکن یہ پہلے ہی معلوم ہو چکا، کہ میں ایسی چیزوں میں دھوکا نہیں کھا سکتا، جن کے دلائل کا مجھ کو واضح علم حاصل ہے پھر کیا یہ ہو سکتا ہے، کہ میں نے بھرتی چیزوں کو بھلے صحیح خیال کیا تھا، جو بعد کو غلط نکلیں؟ لیکن ان کا دراصل مجھ کو کوئی واضح و صاف علم ہی نہیں حاصل تھا بلکہ اس وقت تک میں اس قاعدہ ہی سے جا مل تھا، جس سے صداقت کا یقین ہوتا ہے، اور ایسے دلائل کی بنا پر ان کو قبول کر لیا تھا، جن کو اب میں اتنا قوی نہیں پاتا، جتنا کہ اس وقت سمجھا تھا۔ پھر اب اور کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید میں سو رہا ہوں (جیسا کہ میں خود اوپر کہہ چکا ہوں) یا میرے سارے خیالات ان خوابوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے، جو سونے کی حالت میں دیکھتا ہوں؟ لیکن اگر میں سو بھی رہا ہوں، تو بھی جو شئی میرے ذہن میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے، وہ قطعاً صحیح ہے۔

لہذا اب اچھی طرح یہ معلوم ہو جاتا ہے، کہ ہر علم کی صداقت و قطعیت کی بنیاد تمام تر خدا کے صحیح علم پر ہے، اس لئے جب تک میں نے اس کو نہیں جانا تھا، کسی شئی کو بھی پوری طرح نہیں جان سکتا تھا۔ لیکن اب جب کہ خدا کو جان لیا، تو وہ ذریعہ ہاتھ آگیا جس سے بے شمار چیزوں کا پورا علم حاصل ہو سکتا ہے، صرف انہیں چیزوں کا نہیں، جو خود خدا کے اندر ہیں، بلکہ ان کا بھی،

جن کا مذاق حقیقتاً پیچیدہ سے ہے، یہاں تک کہ وہ علمائے ہندو  
 کے دلائل کا موضوع بن سکتی ہے، جن کو اس کے وجود سے  
 کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

---



## تفکر ششم

## مادی اشیا کا وجود اور انسان کے نفس میں فرق

اب صرف یہ تحقیق کرنا رہ گیا ہے کہ آیا مادی اشیا کا بھی کوئی وجود ہے۔ اتنا تو ہم کو معلوم ہی ہے کہ ہندسہ میں ان اشیا کی جو حیثیت ہے، کم از کم اس حیثیت سے ان کا وجود تو ممکن ہی ہے، کیونکہ اس حیثیت سے ان کا واضح و علی طور پر تشقل کر سکتا ہوں۔ اور جس چیز کا واضح طور پر تصور یا تشقل کرنے کے میں قابل ہوں، اس میں شک نہیں، کہ خدا اس کو پیدا کرنے پر بھی قادر ہے، اسکو صرف ایسی ہی چیزوں کی تخلیق پر میں قادر نہیں سمجھتا جن کے تشقل میں مجھ کو میناقص محسوس ہوتا ہو۔ مزید برآں میرے اندر تحلیل یا تشقل کی جو قوت ہے، (اور جس کا استعمال جیسا کہ تجربہ شاید ہے، میں اس وقت کرتا ہوں، جسکے مادی اشیا کو سمجھنا چاہتا ہوں) وہ ان کے وجود کو ماننے پر مائل کرتی ہے۔ اس لئے کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ تشقل کیا ہے، یہ نام ہے، محض ایسے جسم پر قوت ہر کہ کے استعمال کا، جو براہ راست اور علانیہ اس کے سامنے ہے

لہذا وہ موجود ہے۔

یاد رہے کہ زیادہ صاف کرنے کے لئے میں پہلے تخیل اور عقل کے  
 بائیکاٹ کا فرق سمجھ کر دیتا ہوں۔ مثلاً جس وقت میں مثلث کا تخیل  
 کرتا ہوں تو صرف اس کا عقل نہیں کرتا کہ یہ تین سطحوں سے بنی ہوئی ایک  
 شکل ہے بلکہ ساتھ ہی اپنی ذہنی قوت اور اس کے اندر رونی استعمال سے  
 ان سطحوں کو دیکھتا ہوں، اور اس کو میں صحیح معنی میں تخیل کہتا  
 ہوں۔ خلافت اس کے اگر بائیں ہزار اضلاعی شکل کا خیال کرنا چاہوں، تو  
 اس کا تو میں ٹھیک ٹھیک عقل کرتا ہوں کہ یہ ہزار اضلاع سے بنی  
 ہے، اسی آسانی کے ساتھ جس طرح اس کا کہ مثلث تین اضلاع سے  
 بنا ہے، لیکن ہزار اضلاعی شکل کے ہزار اضلاع کا تخیل میں اس طرح  
 نہیں کر سکتا، جس طرح کہ مثلث کے تین ضلعوں کا کرتا ہوں، یعنی ان کو  
 اپنی نگاہ ذہن کے روبرو نہیں لاسکتا۔ اور اگرچہ اس عام عادت کی  
 بناء پر کہ جب جسمانی چیزوں کا خیال کرتا ہوں، تو ہمیشہ تخیل سے کام لیتا  
 ہوں، ہزار اضلاعی شکل کے عقل میں بھی ذہن کے سامنے ایک مختل یا  
 پریشان شکل آجاتی ہے، تاہم یہ ہزار اضلاع کی بظاہر ہے، کہ نہیں ہوتی  
 کیونکہ اس میں اور اس ہزار اضلاع والی یا اس طرح کی کسی اور کثیر  
 الاضلاع شکل کے خیال کے وقت ذہن کے سامنے جو شکل ہوتی ہے  
 اس میں کسی طرح کا فرق نہیں ہوتا، نہ ان دونوں کی پیش ذہن یا نامندہ  
 اشکال سے ہم ہزار اضلاعی اور دیگر کثیر الاضلاع شکلوں کے خواص میں جو  
 فرق ہے، اس کو معلوم کر سکتے ہیں۔

لیکن اگرچہ اس طرحی شکل کا سوال ہو، تو یہ بالکل صحیح ہے  
 کہ اس کی صورت کا بھی تخیل کی بدولت کے بغیر میں اسی طرح عقل کر سکتا  
 ہوں، جس طرح کہ ہزار اضلاعی شکل کا، لیکن ساتھ ہی اس کے بائیں  
 اضلاع میں سے ہر ایک کی طرف، ہزار ان سے گھرے ہوئے رقبہ کی  
 طرف ذہن کو متوجہ کر کے اس شکل کا تخیل بھی کر سکتا ہوں۔ لہذا

معلوم ہوا کہ خیال کی صورت میں ذہن پر جو خاص ضرورت ڈالنا پڑتا ہے، فہم یا تعقل کی صورت میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی، اور اسی سے صراحتہً خیال و تعقل دونوں کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔

علاوہ بریں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے، کہ خیال کی یہ قوت جو میرے اندر پائی جاتی ہے، جہاں تک کہ یہ تعقل سے مختلف ہے، وہاں تک یہ میری ذہنی فطرت یا حقیقت کا کوئی لازمہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ قوت میرے اندر نہ موجود ہوتی، تو بھی میں ہمیشہ وہی رہتا، جواب ہوں جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں، کہ اس کی بنیاد میرے ذہن کے سوا کسی اور شے پر ہے۔ اور یہ بات آسانی سے میری سمجھ میں آ جاتی ہے، کہ اگر کوئی اور جسم موجود ہے، جس کے ساتھ میرا ذہن اس طرح مربوط و منبذ ہے، کہ یہ جب چاہے، اس کا خیال کر سکتا ہے، تو یہ جسمانی اشیاء کا اس ذریعہ سے تخیل کر سکتا ہے۔ غرض تخیل اور فاعل تعقل میں صرف یہ فرق ہے، کہ تعقل کے وقت ذہن کسی نہ کسی طرح خود اپنی طرف راجع ہوتا ہے، اور کسی ایسے تصور کا خیال کرتا ہے، جو خود اس کے اندر موجود ہے، بخلاف اس کے تخیل میں یہ جسم کی طرف راجع ہوتا ہے، اور اس میں کسی ایسی شے کا خیال سامنے ہوتا ہے، جو یا تو اس تصور کے موافق ہو، جو اس نے خود بنایا ہے، یا جو جو اس کے ذریعہ سے حاصل کیا ہے۔ اگر اجسام کا وجود ہے، تو تخیل کے پیدا ہونے کا یہ طریقہ آسانی سے میری سمجھ میں آ جاتا ہے، اور چونکہ اس کی توجیہ کا کوئی اور واضح طریقہ نہیں پاتا، اس لئے قیاس کر لیتا ہوں، کہ غالباً اجسام ہیں، لیکن بس غالباً ہی۔ اور گوتام چیزوں کو احتیاط کے ساتھ جانچتا ہوں، تاہم میرے تخیل میں حقیقت جسم کا جو صاف تصور پایا جاتا ہے، اس سے کوئی ایسی دلیل نہیں اخذ کر سکتا، جس سے کسی جسم کے وجود کا نتیجہ لازماً نکال سکوں۔

لیکن اس حقیقت جمیہ کے علاوہ جو ہندسہ کا موضوع ہے، اور بھی بہت سی چیزوں کے خیال کا میں عادی ہوں، گوان کا تخیل

حقیقت جسمیہ کا اتنا صاف نہ ہو، مثلاً رنگ، آواز، مزہ، تکلیف وغیرہ۔  
 اور چونکہ ان کا اور اک حواس سے بہت سیطرہ بقیہ پر ہوتا ہے، جن کے  
 ماحول کے واسطے سے بظاہر یہ میرے شکل تک پہنچتے ہیں لہذا میں  
 سمجھتا ہوں، کہ ان کی زیادہ آسانی کے ساتھ جانچ کے لئے اس امر کی بھی  
 ساتھ ہی جانچ مناسب ہوگی کہ احساس یا اور اک کیا ہے، اور دیکھنا  
 چاہئے، کہ آیا احساس کے ذریعہ سے جو تصورات میرے ذہن میں پیدا  
 ہوتے ہیں، کیا ان سے جسمانی اشیاء کے وجود کا کوئی قطعی ثبوت  
 مجھ کو نہیں مل سکتا۔

سب سے پہلے میں ان چیزوں پر غور کروں گا، جن کو حواس سے  
 ماخوذ ہونے کی بنا پر اب تک صحیح یقین کرتا تھا، اور دیکھوں گا، کہ  
 اس یقین کے وجود کیا تھے۔ اس کے بعد ان اسباب کی تحقیق کروں گا،  
 جن سے یہ یقین متزلزل ہوا، اور پھر سب سے آخر میں اس پر بحث  
 کروں گا، کہ اب ان جسمانی اشیاء کی نسبت مجھ کو کیا باور کرنا چاہئے۔  
 پہلی بات میں نے یہ محسوس کی، کہ میں سر، ہاتھ، پاؤں وغیرہ  
 دیگر اعضاء رکھتا ہوں، جن سے وہ جسم بنا ہے، جس کو میں اپنا جز  
 بلکہ کہنا چاہئے، کہ کل خیال کرتا ہوں، فرید ہوں یہ بھی محسوس ہوا،  
 کہ اس جسم کے ساتھ بہت سے دوسرے اجسام بھی پائے جاتے  
 ہیں، جن سے اس کو مختلف قسم کے منافع یا مضار پہنچتے ہیں منافع کی صورت  
 میں لذت یا تسکین کا ایک خاص احساس ہوتا ہے، اور مضار کی صورت میں  
 اہم کا۔ اس لذت و اہم کے علاوہ بھوک پیاس وغیرہ کی انتہا بھی اپنے  
 اندر محسوس کی، نیز خوشی، غم، غصہ وغیرہ جذبات کی طرف خاص جسمانی میلانا  
 بھی اور اپنی ذات سے باہر دوسرے اجسام میں، امتداد، شکل و صورت  
 اور حرکات کے علاوہ سمجھ گریہ وغیرہ کی کسی جسمی چیز کا بھی اور اک ہوا،  
 نیز روشنی، رنگ، بو، مزہ اور آواز کا بھی، جن کے اختلافات سے  
 مجھ کو زمین، آسمان، سمندر وغیرہ تمام اجسام کی باہم ایک دوسرے

سے غیر ہوتی ہے۔

اور چونکہ میرے ذہن کو براہ راست صحیح طریقہ صرف ان  
صفات کے تصورات ہی حاصل تھے، اس لئے یہ نقیض کہنا ہے وجہ  
نہ تھا، کہ مجھ کو ایسی چیزوں یا اجسام کا شعور ہے، جو میرے ذہن کے  
بالکل مختلف ہیں، اور جن سے یہ تصورات ناشی ہوتے ہیں۔ کیونکہ  
ان تصورات کے پیدا ہونے میں میری مرضی کو دخل نہ تھا، میری  
مرضی کچھ بھی ہو، لیکن جب تک کوئی نقیض میرے حواس کے سامنے نہ  
ہو، اس وقت تک اس کا شعور نہیں ہو سکتا تھا، نہ یہ کسی طرح میری  
قدرت میں تھا، کہ جب یہ حواس کے سامنے ہو، تو نہ محسوس کروں۔  
نیز جن تصورات کا ادراک مجھ کو حواس سے ہوتا تھا، وہ چونکہ  
ان تمام تصورات سے بہت زیادہ جلی و قطعی بلکہ بجائے خود بہت زیادہ  
صاف و واضح ہوتے تھے، جن کو میں خود تفکر سے پیدا کرتا تھا، یا  
جن کو حافظہ میں مرتبہ پاتا تھا اس لئے یہی سمجھ میں آتا تھا، کہ یہ میرے  
ذہن سے نہیں ناشی ہو سکتے، لہذا لازماً ان کی علت کچھ اور چیزوں  
ہونی چاہئیں، اور ان چیزوں کے متعلق جو کچھ مجھ کو علم تھا وہ صرف وہی  
تھا جو ان کے تصورات سے حاصل ہوتا تھا اس کے سوا اور کیا ذہن میں آ سکتا  
تھا، کہ یہ چیزیں ویسی ہی ہیں، جیسے کہ ان کے آفریدہ تصورات۔  
پھر مجھے کو یہ بھی معلوم تھا، کہ میں عقل سے زیادہ حواس سے  
کا امتیاز ہوں اور جو تصورات میں خود قایم کرتا تھا وہ اتنے صاف و قطعی نہ  
ہوتے تھے، جتنے کہ وہ جن کا ادراک حواس سے ہوتا تھا، بلکہ یہ زیادہ تر  
حواس اور احوال کے اجزاء سے مرکب ہوتے تھے، لہذا میں نے  
آسانی سے نتیجہ نکال لیا تھا، کہ میرے ذہن میں کوئی تصور بھی ایسا نہیں  
جو پہلے حواس سے نہ گذر چکا ہو۔

علیٰ ہذا میرا نقیض بھی ہے وجہ نہ تھا، کہ جس جسم کو ایک خاص حق کی  
بنیاد پر اپنا کہتا ہوں وہ کسی اور جسم کی بہ نسبت میری ذات سے زیادہ



صحیح و واقعی طور پر تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے کہ دیگر اجسام کی طرح اس سے  
 میں درحقیقت کبھی جدا نہیں ہو سکتا ہوں، اسی کے اندر اور اس کے  
 واسطے سے اپنی تمام اشتہاؤں اور تاثرات کو میں محسوس کرتا ہوں  
 اور سب سے آخر یہ کہ اس کے مختلف حصوں میں مجھ کو لذت و الم کا  
 احساس ہوتا ہے، نہ کہ ان اجسام میں جو مجھ سے الگ ہیں۔  
 لیکن جب میں نے یہ جاننا چاہا کہ الم کے اس متحول الکے جس  
 غم اور لذت کی حس سے خوشی کیوں پیدا ہوتی ہے، یا بیٹ کی اس  
 خاص ناقابل بیان خواہش سے جس کو بھوک کہتا ہوں، کھانسی اور رطوبت کی  
 خشکی سے پانی کی خواہش کیوں رونما ہوتی، تو اس قسم کی چیزوں کی میں  
 اس کے سوا کوئی توجیہ نہ کر سکا، کہ بس فطرت کی یہی تعلیم یا اقتضائے  
 اس لئے کہ بیٹ کی ایک خاص کیفیت اور کھانسنے کی خواہش میں اس سے  
 زیادہ قطعاً کوئی ربط یا تعلق نہیں ہے، واکم ازہ کم میں سمجھ نہیں سکتا، جتنا کہ  
 کسی مولم شے کے احساس اور غم کے اس خیال میں ہے، جو کہ اس احساس  
 پیدا ہوتا ہے۔ یہی حال حواس سے متعلق میرے تمام دیگر احکام کا بھی  
 معلوم ہوتا تھا، کہ بس یہ فطرت کے احکام ہیں، اس لئے کہ یہ میرے  
 اندر کسی ایسی دلیل پر غور کرنے سے پہلے ہی پیدا ہو جاتے ہیں، جو  
 ان کے ماننے یا لگانے پر مجبور کرے۔

مگر بعد کو بہت سے تجربات کی بناء پر آہستہ آہستہ حواس سے  
 میرا یہ سارا اعتقاد اٹھٹا گیا۔ مثلاً بار بار میں نے دیکھا، کہ جو مینار بہت  
 دور سے گول دکھائی دیتے تھے، قریب سے مربع نظر آئے، ایسی طرح  
 ان میناروں کے اوپر جو قوتی میکل بہت نصب تھے، وہ مجھے سے مجھ کو  
 چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ اور بھی بے شمار مواقع پر ظاہری حواس کے  
 احکام میں مجھ کو غلطی محسوس ہوئی، صرف ظاہری ہی نہیں بلکہ باطنی حواس  
 میں بھی۔ مثلاً درد سے زیادہ کون سی چیز اندرونی یا باطنی ہو سکتی  
 ہے؟ پھر بھی میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جن کے ہاتھ پاؤں کٹ گئے

تھے، کہ بعض اوقات وہ ان اعضا میں درد محسوس کرتے تھے، حالانکہ اب میرے سے ان کے جسم میں ان اعضا کا وجود ہی نہ تھا، جس سے مجھے کو خیال ہوا، کہ بالکل ممکن ہے کہ اس طرح کسی عضو میں مجھے کو درد محسوس ہو رہا ہو، اور واقعاً نہ ہو۔

شک کے ان وجود پر دو کام میں نے اور اضافہ کیا ہے، جو بہت زیادہ عامۃ الوجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ بیداری کی حالت میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں، اس میں کوئی ایسی شے نہیں ہوتی جس کو کبھی نہ کبھی خواب کی حالت میں بھی نہ محسوس کیا ہو، یا نہ محسوس کر سکتا ہوں۔ اور چونکہ خواب کی حالت میں جن چیزوں کا احساس کرتا ہوں ان کے متعلق یہ نہیں یقین کرتا، کہ میری ذات سے باہر موجود ہوتی ہیں، لہذا سمجھتا ہوں کہ بیداری کی حالت میں جن چیزوں کا احساس ہوتا ہے، ایسی نسبت کیوں ایسا یقین کرنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اب تک اپنی ذات خالق کا حکم نہیں حاصل تھا، یا فرض کر لیا گیا تھا، کہ نہیں حاصل تھا، اس لئے میرے پاس اس کے غلات کوئی دلیل نہ تھی، کہ فطرت نے مجھے کو ایسا بنا دیا ہو، جو چیزیں بظاہر قلمی سے قطعی معلوم ہوتی ہوں، ان میں بھی وحقیقت و صحت کا گھار ہا ہوں۔

باقی جن وجود و دلائل کی بنا پر اب تک محسوسات کی صداقت پر یقین رکھتا تھا، ان کی تردید میں چنداں و شواہد ہی نہ تھی۔ اس لئے کہ مثلاً فطرت کی دلیل کو لو، کہ جن چیزوں کی طرف یہ لیجاتی ہے بار بار دیکھا، کہ بعد کو عقل سے وہ غلط ثابت ہوئی ہیں، لہذا فطرت کی رہبری یا اقتدار پر زیادہ بہرہ رسہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسری دلیل کہ حواس سے جو تصورات حاصل ہوتے ہیں، وہ میرے ارادے کے تابع نہیں ہوتے لیکن اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے، کہ اگر وہ میرے ارادے کے تابع نہیں، تو لازماً ان کو میرے ہوا کسی اور ہی شے سے مانع ہو کر مانع ہونے چاہئے، ممکن ہے، کہ خود میرے ہی اندر کوئی ایسی قوت ہو جس کا

اب تک علم نہیں حاصل، جو ان کی علت ہو، اور ان کو پیدا کرتی ہو۔  
 اور اب جبکہ میں نے اپنے کو بہتر طریقہ سے جاننا شروع کیا  
 ہے، اور اپنے پیدا کرنے والے کا علم زیادہ واضح ہو گیا ہے، تو  
 یہ ٹھیک نہیں کہ حواس کی تعلیم کو قبول کرنے میں جلد بازی سے کام  
 لوں، نہ میرے نزدیک، دوسری طرف یہ درست ہے، کہ بلا سوچے  
 سمجھے سب کو ایک سر سے سے مشکوک ہی قرار دیا جائے۔

اولاً تو میں یہ جانتا ہوں، کہ جن چیزوں کا مجھ کو واضح و جلی  
 تغل حاصل ہے، خدا ان کو جو تک اس تغل کے مطابق پیدا کر سکتا  
 ہے، لہذا کسی چیز کے دوسری چیز سے مختلف و ممتاز ہونے کیلئے  
 اتنا کافی ہے، کہ میں پہلی کا دوسری کے بغیر واضح و جلی طور پر تغل  
 کر سکتا ہوں، اس لئے کہ کم از کم خدا کی قدرت کا ملہ تو ان کو ایک  
 دوسرے سے الگ کر ہی سکتی ہے اور ان کو الگ یا مختلف سمجھنے کے  
 لئے اس کی بحث نہیں پیدا ہوتی، کہ کس قوت نے الگ کیا ہے۔  
 لہذا محض اس واقعہ سے کہ میں قطعیت کے ساتھ یہ جانتا ہوں، کہ  
 موجود ہوں، ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہے، کہ میری ذات یا حقیقت  
 اس کے سوا اور کسی شے کو قطعاً متلزم نہیں، کہ میں ایک سوچنے  
 والی شے ہوں، جس سے لازمی نتیجہ نکلتا ہے، کہ میری حقیقت دراصل  
 صرف اسی قدر ہے، کہ میں ایک ایسی شے ہوں، جو سوچتی ہے،  
 یا ایک ایسا جوہر جس کی حقیقت و اہمیت محض سوچنا ہے اور اگرچہ یہ  
 اغلب بلکہ قطعی ہے (جیسا کہ ابھی معلوم ہو گا) کہ میں ایک ایسا جسم  
 رکھتا ہوں جس کے ساتھ مجھ کو بہت سخت وابستگی یا قریب کا تعلق  
 ہے، تاہم چونکہ ایک طرف مجھ کو خود اپنی ذات کے متعلق یہ واضح و  
 جلی تصور حاصل ہے، کہ میں محض ایک ایسی شے ہوں، جو سوچتی ہے،  
 اور محسوس نہیں ہے، دوسری طرف جسم کی نسبت یہ واضح تصور  
 رکھتا ہوں، کہ وہ محض ایک محسوس اور نہ سوچنے والی شے ہے، لہذا

اتنا بالکل یقینی ہے کہ میں یعنی میرا ذہن (جس کی بدولت میں ہوں وہ) قطعاً اور بالکلیہ میرے جسم سے جدا ہے، اور اس لئے بغیر اس کے پایا جاسکتا ہے یا پایا جاتا ہے۔

علاوہ بریں میں اپنے اندر سوچنے کی مختلف قوتیں پاتا ہوں، جن میں سے ہر ایک اپنی ایک خاص نوعیت رکھتی ہے۔ مثلاً میں اپنے اندر تحریک اور احساس کی قوتیں پاتا ہوں، جن کے بغیر واضح و جلی طور پر میں اپنے کو ایک ذات یا حقیقت سمجھتا ہوں، بر خلاف اسکے ان قوتوں کو اپنے یعنی ایک ایسے جو ہر ذی عقل کے بغیر موجود و مستقل بالذات نہیں سمجھتا، جس کے ساتھ یہ قایم یا وابستہ ہیں۔ اس لئے کہ ان قوتوں کا جو تصور یا عقل میں رکھتا ہوں، اس کی رو سے یہ کسی نہ کسی طرح کے ذہن یا عقل کو ضرور متضمن ہیں، لہذا میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری ذات سے اسی طرح مختلف ہیں، جس طرح کہ اعراض اشیاء سے مختلف ہوتے ہیں۔

اسی طرح مجھے اور قوتوں کو بھی پاتا ہوں، مثلاً انتقال مکانی یا اٹھنا پڑنا وغیرہ کی قوتیں کہ ان کا عقل بھی احساس و غیرہ کی طرح کسی جو ہر کے ساتھ وابستگی یا قیام کے بغیر نہیں ہو سکتا، لہذا بغیر اس جو ہر کے یہ پائی بھی نہیں جاسکتیں۔ لیکن یہ قوتیں اگر موجود ہیں، تو پھر یہ بالکل بدیہی ہے کہ ان کا تعلق کسی مادی یا متحد جسم سے ہونا چاہئے، نہ کہ ذی عقل جو ہر سے۔ اس لئے کہ ان کا واضح و جلی عقل کسی نہ کسی طرح کے امتداد کو تو ضرور متضمن ہے، لیکن ذہن کو قطعاً مستلزم نہیں ہے۔

اس کے علاوہ میرے اندر احساس یا قابل حس اشیاء کے تصورات کو جاننے اور حاصل کرنے کی ایک خاص انفعالی قوت پائی جاتی ہے، جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن ان تصورات کو بنانے اور پیدا کرنے والی اگر کوئی فاعلی قوت میرے اندر رہا ہر نہ ہوتی تو یہ انفعالی قوت بالکل بے کار ہوتی، اور اس لئے میں کوئی کام ہی



نہ لے سکتا۔ مگر میں چونکہ محض ایک سوچنے والی شے ہوں، اس لئے یہ  
 فاعلی قوت میرے اندر نہ ہو نہیں سکتی، کیونکہ یہ سوچ یا خیال کو مستلزم  
 نہیں، نیز حسی تصورات میرے اندر انکڑا اس طرح پیدا ہوئے رہتے ہیں،  
 کہ خود میری اعانت قطعاً شریک نہیں ہوتی، بلکہ میرے ارادہ کے  
 غلامت ہوئے ہیں، لہذا ان کی فاعلی قوت کو لائے گا میرے سوا کسی اور  
 جو میں پایا جانا چاہئے، جس کو صوری یا اعلیٰ طور پر دجیسا کہ میں اوپر  
 کہہ آیا ہوں، اس ساری حقیقت کو مشتمل ہونا چاہئے، جو اس کے پیدا  
 کردہ تصورات میں معروضی طور پر پائی جاتی ہے اور یہ جو ہر با تو  
 جسم یعنی مادی نوعیت کا ہو گا، جس میں صوری طور پر اور حقیقتہً وہ  
 سب شامل ہے، جو معروضی طور پر اور استحضاراً ان تصورات میں  
 پایا جاتا ہے، یا پھر کوئی ایسی مخلوق ہو گا جو جسم سے بھی اعلیٰ ہو،  
 جس میں خود مبہم شامل ہو۔

لیکن خدا چونکہ دھوکا دینے والا نہیں ہے، لہذا ظاہر ہے، کہ  
 وہ خود براہ راست ان تصورات کو میرے اندر نہیں پہنچاتا، نہ کسی ایسی  
 مخلوق کے واسطے سے، جن میں ان تصورات کی حقیقت صوری طور پر  
 نہیں، بلکہ محض اعلیٰ طور پر شامل ہے۔ اس لئے، کہ جب خدا نے مجھ کو  
 کوئی ایسی قوت نہیں عطا فرمائی جس سے میں جان سکوں، کہ صورت حال  
 یہ ہے، بلکہ اس کے خلاف نہایت قوی رجحان میرے اندر اس  
 بات کا پیدا کر دیا ہے، کہ ان کو مادی اشیاء کا آفریدہ نہیں کروں،  
 تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ خدا کو دھوکے کے الزام سے میں  
 کیسے پاک رکھ سکتا ہوں، اگر یہ تصورات دراصل کہیں اور سے  
 آئے ہیں، یا ایسی علموں کے آفریدہ ہیں، جو مادی نہیں ہیں۔ لہذا ہر کو  
 یہی نتیجہ نکالنا چاہئے کہ مادی اشیاء موجود ہیں۔ البتہ یہ تمام تر شاید  
 ویسی ہی نہیں ہو میں جیسا کہ ہم ان کا حواس سے ادراک کرتے ہیں  
 اس لئے کہ حواس کے ادراک کو بہتری چیز میں نہایت مبہم و مستہ



بنا دیتی ہیں۔ تاہم کم از کم اتنا اعتراف کرنا پڑے گا، کہ ان میں جس شے کا ہم واضح و جلی طور پر ادراک کر سکتے ہیں یا کئی طور سے بوں کہہ سکتے ہیں شے کا تعلق نظری ہند سے ہو، وہ واقعات ان میں پائی جاتی ہے۔

پائی رہیں دوسری چیزیں، جو یا تو محض جزئی ہوتی ہیں، مثلاً آفتاب اتنا بڑا ہے، اس کی ایسی شکل ہے وغیرہ یا جن کا تعلق پوری طرح واضح و جلی نہیں ہوتا، جیسے کہ روشنی، آواز، دور دور وغیرہ تو گو یہ نہایت ہی مشکوک غیر یقینی ہو سکتی ہیں، تاہم صرف اس واقعہ کی بنا پر کہ خدا و صو کا نہیں دینا اور اس لئے اس نے یہ جائز نہ رکھا ہو گا، کہ مجھ کو کسی ایسی غلطی میں مبتلا ہو نا پڑے، جس کی تصحیح کی میرے اندر کوئی قوت نہ رہی ہو، لہذا میں اب بے خرخشہ یہ نتیجہ نکال سکتا ہوں کہ میرے اندر سچائی تک پہنچنے کے وسائل موجود ہیں۔

اور اس طرح سب سے پہلی شے جو ناقابل شک شک ٹھہرتی ہے یہ ہے، کہ جس چیز کی فطرت تعلیم کرتی ہے، اس میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے۔ اس لئے کہ کلی طور پر فطرت سے میری مراد اب خود خدا کی ذات یا اس نظم و طبیعت کے سوا اور کچھ نہیں جو خدا نے مخلوقات میں دو بیعت فرمادی ہے۔ اور جزئی طور پر فطرت سے میری مراد ان تمام چیزوں کا مجموعہ یا وہ حاصل ساخت ہے، جو مجھ کو عطا کی گئی ہے اور فطرت کی کوئی تعلیم انہی علانیہ و صریح نہیں ہے، جتنی یہ کہ میں ایک ایسا جسم رکھتا ہوں جو تکلیف کے احساس سے طے نہ ملتا ہے، جو بھوک اور پیاس کا جب میں احساس کرتا ہوں تو وہ کھانے اور پینے کا محتاج ہوتا ہے وغیرہ والک۔ لہذا مجھ کو شک نہ کرنا چاہئے، کہ ان چیزوں میں کچھ صداقت ضرور ہے۔

تکلیف اور بھوک، پیاس وغیرہ کے ان احساسات کی بنا پر فطرت مجھ کو یہ بھی سکھاتی ہے، کہ میں اپنے جسم میں محض اس طرح نہیں ہوں، جس طرح کہ طالع اپنی کشتی میں ہوتا ہے، بلکہ میں اس میں بجم

ایسا گھلا ملا، یا خلط ملا اور اس کے ساتھ کچھ ایسا شدید وابستہ و مربوط ہوں، کہ بالکل ایک ہو گیا ہوں۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو جو وقت مثلاً میرا جسم زخمی ہو جاتا ہے، مجھ کو جو محض ایک سوچنے والی شے ہے، کوئی تکلیف نہ محسوس ہونی چاہئے تھی، بلکہ اس زخم کا اور اک ٹھکانہ فہم سے محض اس طرح ہونا چاہئے تھا جس طرح کہ شستی اگر کہیں سے ٹوٹ جائے، تو تلاح کو آنکھ سے اس کا اور اک ہوتا ہے۔ اور جب میرا جسم کھانے یا پینے کا محتاج ہوتا ہے، تو اس وقت بھوک یا پیاس کے احساس کے بغیر خالی اس احتیاج کا علم ہو جانا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ بھوک، پیاس، تکلیف و غیرہ تمام احساسات دراصل فکریا سوچ ہی کے خاص خاص کوائف ہیں، جو ذہن کے جسم کے ساتھ اتحاد اور دونوں کی کہنا چاہئے کہ آمیزشیں پر مبنی اور اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ فطرت مجھ کو یہ بھی بتلاتی ہے، کہ میرے ارد گرد اور بھی بہت سے اجسام پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض کا میں طالب ہوتا ہوں اور بعض سے احتراز کرتا ہوں۔ اور چونکہ مجھ کو مختلف طرح کے رنگوں، آوازوں، مزوں، بوؤں اور سخی گرمی و غیرہ کا احساس ہوتا ہے، لہذا میں خواہ مخواہ یہ نتیجہ نکالنے لگتا ہوں کہ جو اس کے یہ مختلف و متنوع اوراکات جن اجسام سے حاصل ہوتے ہیں، خود ان اجسام میں بھی ان کے مقابل میں کچھ نہ کچھ اختلافات ضروری پائے جاتے ہیں، گو یہ اختلافات حقیقتہً ان اوراکات کے مماثل نہ ہوں۔ اور چونکہ جو اس کے ان گونا گوں اوراکات میں سے بعض میرے لئے خوشگوار ہوتے ہیں اور بعض ناگوار، لہذا اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ میرا جسم دیا میری مادی ذات باری معنیٰ کہ وہ جسم و روح سے مل کر بنی ہے، اپنے ارد گرد کے دیگر اجسام سے مختلف طرح کی آسانیاں یا دشواریاں محسوس کرتا ہے۔

لیکن بہت سی ایسی چیزیں بھی ہیں، جو بظاہر فطرت کی تعلیم معلوم ہوتی ہیں، لیکن دراصل میں نے ان کو فطرت سے نہیں سیکھا ہے، بلکہ وہ میرے ذہن میں محض اس بنا پر جاگزیں ہو گئی ہیں، کہ بعض چیزوں کا حکم عادتہ سوچے سمجھے بغیر لگا دینا ہوں، اور اس لئے اس میں آسانی سے غلطی ہو جاسکتی ہے۔ مثلاً میرا یہ خیال کہ ہر ایسی جگہ یا مکان جس میں کوئی ایسی شے نہیں، جو حرکت کر رہی ہو، اور میرے حواس پر اثر ڈال رہی ہو، وہ خالی ہے۔ یا اسی طرح جو جسم گرم ہے، اس میں کوئی ایسی شے باقی جاتی ہے، جو گرمی کے اس تصور کے حامل ہے جو میرے اندر موجود ہے۔ یا کسی سفید یا سیاہ جسم میں وہی سفید ہی یا سیاہ ہی ہے جس کو میں محسوس کر رہا ہوں اور شیریں یا تلخ جسم میں وہی مٹھوٹا ہے، جو مجھ کو مل رہا ہے۔ یہی حال اور دو بھری چیزوں کا بھی ہے، مثلاً ستارے یا مینار وغیرہ جو اجسام ہم سے بہت دور ہیں ان کی نسبت یہ خیال کہ یہ جس قدر وقامت اور شکل و صورت کے اتنی دور سے آنکھ کو نظر آتے ہیں وہی فی نفسہ ان میں موجود ہے لہذا اس غرض سے کہ کوئی ایسی شے نہ رہ جائے جس کا جھکو واضح و جلی تغفل نہ حاصل ہو، پہلے مجھ کو اس کی ٹھیک تعریف و تحدید کر لینی چاہئے کہ فطرت کی تعلیم سے میں کیا مطلب سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ یہاں فطرت کا لفظ میں اس سے بہت تنگ مفہوم میں استعمال کر رہا ہوں، جبکہ اس سے میری مراد تمام ان چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے جو خدا نے مجھ کو دی ہیں، کیونکہ یہ مجموعہ یا ساخت بہت سی ایسی چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے، جو صرف ذہن کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کو یہاں لفظ فطرت کے مفہوم میں داخل نہیں کرتا۔ مثلاً میرا یہ خیال کہ کیے کو انگیا نہیں بنایا جاسکتا ہے، اس طرح کی اور بھی ایسی بے شمار باتیں ہیں، جن کو میں جسم کی مدد کے بغیر فطرت کی روشنی سے بانٹتا ہوں۔ نیز فطرت کے مفہوم میں بہت سی

ایسی چیزیں بھی داخل ہیں، جو صرف جسم کے ساتھ حاصل ہیں یہاں فطرت کے لفظ میں وہ بھی نہیں شامل ہیں، مثلاً جسم میں بھاری ہونے کی جو صفت پائی جاتی ہے، اسی طرح کی اور اشیاء بھی ہیں، جو لفظ فطرت کے اس مفہوم میں داخل نہیں ہیں، جس میں کہ میں یہاں اس کو استعمال کر رہا ہوں، بلکہ یہاں میری مراد صرف وہ چیزیں ہیں جو خدا نے مجھ کو اس نسبت سے عطا فرمائی ہیں، کہ میں جسم و نفس دونوں سے مرکب ہوں۔ کیونکہ یہی دراصل وہ فطرت ہے، جو ایسی چیزوں سے احتراز کی تعلیم کرتی ہے، جو تکلیف کے احساس کا باعث ہوں۔ اور ایسی چیزوں کی طلب پر آمادہ کرتی ہے جن سے لذت کا احساس حاصل ہو۔ مگر یہ فطرت مجھ کو اس کی تعلیم نہیں دیتی، کہ جو اس کے ان مختلف ادراکات سے ایسی اشیاء کے بارے میں مجھ کو کوئی نتیجہ نکالنا چاہئے، جو ہم سے باہر ہیں، الا انکم ذہین ان کو احتیاط کے ساتھ اور پوری طرح تحقیق کر لیا ہو اس لئے کہ یہ صرف ذہن کا کام ہے، نہ کہ ذہن و جسم سے مرکب ذات کا، کہ وہ اس طرح کی صداقتوں کو معلوم کرے۔

مثلاً ایک اشارہ کو دیکھنے میں مجھ کو موسم ہٹی کی لو سے زیادہ نہ معلوم ہو، تاہم میرے اندر کوئی ایسی حقیقی یا فطری قوت نہیں موجود جس کی بنا پر میں یقین کر لوں، کہ یہ واقعہ اس لو سے بڑا نہیں۔ مگر بغیر کسی معقول بنیاد کے میں نے حکم اپنی ابتدا لئے عمر سے ایسا ہی لگا رکھا ہے۔ اسی طرح کو اس لو یا شعلہ کے قریب جا کر میں گرمی محسوس کرتا ہوں، بلکہ اگر اور زیادہ قریب ہو جاؤں، تو تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے، تاہم اس کی کوئی دلیل میرے پاس نہیں، کہ خود اس شعلہ میں میرے احساس گرمی کے مماثل کوئی شے اس سے زیادہ موجود ہے، جتنی احساس تکلیف کے مماثل۔ مجھ کو صرف اس قدر یقین کرنے کا حق حاصل ہے، کہ شعلہ میں کوئی ایسی شے، خواہ یہ کچھ ہی ہو،

پائی جاتی ہے، جو گرمی یا تکلیف کے ان احساسات کو میرے اندر  
ابھار دیتی ہے۔

علیٰ ہذا کو ایسا مکان پایا جاسکتا ہے، جس میں کوئی چیز میرے  
حواس کو متحرک و متاثر کرنے والی نہ موجود ہو، تاہم اس سے یہ نتیجہ  
مجھ کو نہ نکالنا چاہئے، کہ اس میں میرے سے کسی طرح کے اجسام ہی کا  
وجود نہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں، کہ اس میں اور اسی طرح کی بہتری چیزوں  
میں دستور فطرت کو مسخ کر دینے کی مجھ کو عادت ہو گئی ہے۔ یہ  
احساسات یا اور اکاثرات ہی تو میرے اندر صرف اس لئے رکھے  
گئے ہیں، کہ یہ جان لوں کہ کیا چیز مفید ہے اور کیا مضر، اور اس  
حد تک یہ احساسات واضح و صاف ہوتے ہیں، لیکن میں ان کو  
اس طرح استعمال کرنے لگتا ہوں، کہ گویا یہ ایسے قطعی قوانین ہیں، جنکے  
ذریعہ سے میں اپنے سے باہر اجسام کی حقیقت یا ماہیت کو براہ راست  
جان لے سکتا ہوں، حالانکہ ان اجسام کے متعلق یہ مجھ کو کوئی ایسی

بات نہیں بتلا سکتے جو نہایت مبہم و تاریک نہ ہو۔  
لیکن ابھی اوپر ہی میں اس امر کی اچھی طرح تحقیق کر چکا ہوں کہ  
ماوجود خدا کے انتہائی فضل و مہربانی کے جو احکام میں لگائے ہوئے ہیں،  
ان میں غلطی کیسے واقع ہوتی ہے۔ مگر یہاں پھر ان چیزوں کے متعلق  
ایک دشواری پیدا ہوتی ہے، جن کی طلب یا جن سے احتراز کی فطرت  
تعلیم کرتی ہے، نیز ان اندرونی حسیات کی نسبت بھی، جو فطرت نے  
میرے اندر رکھے ہیں۔ اس لئے کہ بعض اوقات ان میں بھی غلطی  
معلوم ہوتی ہے، اور اس طرح میری فطرت مجھ کو براہ راست  
دھوکا دیتی ہے۔ مثلاً کسی کھانے کا خوشگوار مزہ، جس میں نہ ہر  
ملا ہوا ہے، اس نہ ہر کے کھا لینے پر آمادہ کر دے سکتا ہے، جو  
صریح دھوکے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر ظاہر ہے، کہ اس صورت  
میں فطرت معذور ہے، اس لئے کہ اس کی رہنمائی کا تعلق



محض اسی غذا کی خواہش ہے، جس کا ذائقہ خوشگوار ہے، نہ کہ زہر کی خواہش سے جو اس کو معلوم ہی نہیں کہ اس میں مالاہوا ہے۔ لہذا اس سے جو نتیجہ ہم نکال سکتے ہیں، وہ صرف اسی قدر کہ میری فطرت کو تمام چیزوں کا کامل علم نہیں حاصل، اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں، کیونکہ انسان کی فطرت محدود ہے، اس لئے اس کا علم بھی بہر حال محدود ہی ہو گا۔

لیکن ہم ایسی چیزوں میں بھی اکثر دھوکا کھاتے رہتے ہیں، جنکی طرف فطرت براہ راست رہنمائی کرتی ہے، مثلاً بیماروں کا ایسی چیز کے کھانے یا پینے کی خواہش کرنا، جو ان کے حق میں مضر ہے اس کے جواب میں شاید یہ کہا جائے گا، کہ اچھے دھوکا کھانے کی وجہ یہ ہے کہ انکی فطرت ہی فاسد ہو گئی ہے۔ لیکن اس سے اعتراض رفع نہیں ہوتا اس لئے کہ بیمار آدمی بھی اسی طرح خدا کی مخلوق کے، جس طرح کہ سندرست آدمی، لہذا جس طرح ایک کی فطرت کا ناقص و پرفراب ہو نا خدا کی مہربانی کے منافی ہے، اسی طرح دو سرے کا بھی اور جیسے کہ ایک خراب بنی ہوئی گھڑی جو ٹھیک وقت نہیں دیتی اسی طرح فطرت کے تمام قوانین کی یا بند ہے، جس طرح جبکہ یہ اپنے بنانے والے کی مرضی کے مطابق ٹھیک کام دیتی ہے۔ ایسے ہی اگر انسانی جسم کو میں ایک مشین قرار دوں، جو اعصاب، عضلات، عروق و خون، جلد وغیرہ سے مل کر اس طرح بنی ہے، کہ اگر اس میں کوئی ذہن یا نفس نہ بھی ہوتا، تو بھی یہ انہیں حرکات کو ظاہر کرتی، جن کو اب یہ دہا ارادہ اور اس لئے لازماً اعانت ذہن، محض اپنے اعضا کی خاص ساخت یا طبیعت کی بنا پر ظاہر کرتی ہے، تو میں انسانی سے سمجھ سکتا ہوں، کہ اس صورت میں بھی اگر یہ جسم مثلاً جلد ر می یا استغالی ہوتا، تو خلق کا خشک ہونا، جو نفس میں پیاس کا احساس پیدا کرتا ہے اور پھر اس خشکی سے اعصاب اور دیگر اعضا کو اسی

طریقہ پر حرکت دینا، جس طریقہ پر کہ پانی پینے میں ضرورت ہوتی ہے اور اس طرح پیاس کو بڑھا کر نقصان پہنچاتا، ویسا ہی فطری ہوتا، جیسا کہ اس وقت ہے، جبکہ خلق کی اس خشکی کی بنا پر پانی کا پینا اس کو نفع پہنچاتا ہے۔ اور گو گھڑی کو اس کے بنانے والے نے جس غرض سے بنایا ہے، اس کی بنا پر جب یہ ٹھیک وقت نہیں دیتی، تو میں کہہ سکتا ہوں، کہ اپنی فطرت سے بغاوت کر رہی ہے، اور گو اسی اصول پر انسانی جسم کو ایک مشین قرار دے کر جو خدا نے ان حرکات کی غرض سے بنائی ہے، جن کو یہ معمولاً انجام دیتی ہے، میں یہ خیال کر سکتا ہوں، کہ جب ایسی صورت میں خلق خشک ہوتا ہے، کہ پانی پینا مضر ہے، تو دراصل جسم اپنی فطرت کے حکم کی اتباع نہیں کر رہا ہے۔ تاہم میں جانتا ہوں، کہ توحید فطرت کا یہ طریقہ اول الذکر سے بالکل مختلف ہے اس لئے کہ یہ شخص ایک خاص خارجی تشبیہ ہے، جس کی بنیاد تمام تر میرے خیال پر ہے جو ہمارے آدمی اور خراب بنی ہوئی گھڑی کا موازنہ میرے اس تصور سے کرتا ہے، جو میں تندرست آدمی اور ٹھیک بنی ہوئی گھڑی کی نسبت رکھتا ہوں، اور جس کی دلالت کسی ایسی چیز پر نہیں ہے، جو حقیقتہً اس شئی میں ہو، بخلاف اس کے پہلے مفہوم میں فطرت سے میری مراد ایسی چیز ہوتی ہے، جو خود اشیاء میں پائی جاتی ہے، اور اس لئے وہ صداقت سے بالکل خالی نہیں ہوتی۔

بلاشبہ استسقا کے مریض کا خلق جب پانی کی واقعی ضرورت کے بغیر خشک ہوتا ہے، تو اس کو فساد فطرت سے موسوم کرنا جو محض ایک خارجی تشبیہ ہے، تاہم نفس یا روح مع جسم کے پورے مرکب کی نسبت یہ خالی تشبیہ نہیں، بلکہ فطرت کی حقیقی غلطی ہے، کہ وہ ایسی حالت میں پیاسی ہوتی ہے، جبکہ دنیا نہایت ہی مضر ہے۔ لہذا یہ امر اب بھی تحقیق طلب ہے، کہ ایسی صورت میں خدا کی مہربانی انسان کی فطرت کو

پر فریب و خطا کار ہونے سے کیوں نہیں روکتی۔

اس کی تحقیق کے لئے سب سے پہلے یہ امر قابل لحاظ ہے، کہ جسم اور نفس میں باہم بڑا فرق ہے۔ جسم اپنی حقیقت کی رو سے منقسم ہے، غلات اس کے نفس بالکلیہ غیر منقسم ہے۔ اس لئے کہ جسم میں اپنی ذات کا اس حیثیت سے خیال کرتا ہوں، کہ صرف ایک ایسی شے ہوں، جو سوچتی ہے، تو اپنے اندر کسی قسم کے اجزاء کا امتیاز نہیں کرتا، بلکہ نہایت واضح طور پر اپنے کو ایک اطلاقی وحدت یا مجموعہ ہوں، اور اگرچہ میرا سارا نفس سارے جسم کے ساتھ متحد معلوم ہوتا ہے، تاہم جب پاؤں ہاتھ یا کوئی حصہ جسم سے کٹ جاتا ہے، تو میں ابھی طرح جانتا ہوں، کہ اس کے ساتھ میرے نفس یا ذہن کا کوئی حصہ جدا نہیں ہو گیا ہے۔ باقی رہیں ارادہ، احساس اور ادراک وغیرہ کی مختلف قوتیں، تو ان کو صحیح معنی میں نفس کے اجزاء نہیں کہا جاسکتا، اس لئے کہ بعینہ سارا کا سارا نفس ارادہ کی حالت میں بھی کار فرما ہوتا ہے، احساس کی حالت میں بھی اور ادراک کی حالت میں بھی لیکن جسمانی یا متدراس شے کی صورت بالکل اس کے خلاف ہے کیونکہ کسی ایسے چھوٹے سے حصے یا جسم کا بھی میں خیال نہیں کر سکتا، جس کو میں اپنے خیال کے ذریعہ باسانی تقسیم نہ کر سکتا ہوں یا جس کو میرا ذہن باسانی بہت سے مختلف اجزاء میں جدا نہ کر لیتا ہو، اور اس لئے لازم آتا ہے اس کو منقسم نہ جانتا ہوں اگرچہ میں بھی معلوم ہوا تھا، تو اب تشریح بالا سے ابھی طرح معلوم ہو گیا ہو گا، کہ انسان کا نفس یا روح اس کے جسم سے بالکل مختلف و جداگانہ شے ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی قابل لحاظ ہے، کہ ذہن اور تمام کو براہ راست ہر حصہ جسم سے نہیں حاصل کرتا، بلکہ محض دماغ یا دماغ کے بھی ایک نہایت ہی چھوٹے حصے سے جس کو جس مشترک کا محل کہا جاتا ہے، جو بعینہ ایک ہی طرح کے متاثر کی صورت میں ہمیشہ ذہن کے اندر بعینہ

ایک ہی طرح کے اور اک کا باعث ہوتا ہے، خواہ دیگر حصص جسم اس وقت دوسری طرح متاثر ہو رہے ہوں، جیسا کہ بے شمار اختیارات سے ثابت ہوتا ہے، جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہو گا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے والی ہے، کہ جسم کی نوعیت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے، کہ اس کا کوئی حصہ اپنے سے دور کسی دوسرے حصہ سے کوئی ایسی حرکت نہیں قبول کر سکتا، جو بعینہ ان دونوں کے درمیانی کسی حصہ سے نہ قبول کر سکتا ہو، خواہ دور والا حصہ اس حالت میں قطعاً کچھ نہ کر رہا ہو۔ مثلاً ایک پھلے ہوئے فیتے کے ا، ب، ج، د، چار حصے فرض کرو، اگر ہم اسکے آخری حصہ د کو حرکت دیں، تو اس کے پہلے حصہ ا میں کوئی ایسی حرکت نہیں پیدا ہو سکتی، جو ان دونوں کے درمیانی حصہ ب یا ج کو حرکت دینے سے اس میں نہ پیدا ہو سکتی ہو، خواہ آخری حصہ د اس حالت میں قطعاً بے حرکت ہی رہا ہو۔ اسی طرح جب مجھ کو اپنے پیر میں درد محسوس ہوتا ہے، تو طبیعات کی رو سے اس حس کا تجربہ ان اعصاب کے واسطے سے ہوتا ہے، جن کا سلسلہ دماغ تک چلا گیا ہے، لہذا جب ان اعصاب میں کوئی تشنج یا کچھاؤ پیدا ہوتا ہے، تو ساتھ ہی دماغ کا وہ حصہ بھی تشنج ہو جاتا ہے، جہاں سے یہ سکھنے اور جس سے مربوط ہیں اور اس طرح اس حصہ دماغ میں ایک ایسی خاص قسم کی حرکت رونما ہوتی، جس کو فطرت نے اسی لئے بنایا ہے کہ ذہن کو ایسا درد محسوس کر لے، جو پیر میں معلوم ہو۔ لیکن پیر کے ان اعصاب کو دماغ تک پہنچنے کے لئے چونکہ ٹانگ، ران، کولے، پیٹھ اور گردن سے گزرنا پڑتا ہے، اس لئے ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے جو کنارے پیر میں واقع ہیں، کو ان میں کوئی حرکت یا متاثر نہ ہو، پھر بھی کولے یا گردن وغیرہ کے پاس سے گزر رہے ہیں درمیان حصہ کی حرکت کی بنا پر، دماغ میں وہی حرکت رونما ہو جائے

جو پیر میں زخم آنے سے روٹتا ہو سکتی تھی اور اس طرح لازم نفس  
 پیر میں درد محسوس کرے گا حالانکہ فی الواقع اس صورت میں پیر میں  
 کچھ بھی نہ ہو گا، یہی حال ہمارے حواس کے دیگر احساسات کا بھی ہے  
 سب سے آخری بات اس بارے میں، جو میں کہنا چاہتا  
 ہوں، یہ ہے کہ جو حرکت دماغ کے اس حصہ میں واقع ہوتی ہے،  
 جس سے کہ نفس براہ راست ارشام کو حاصل کرتا ہے، جو نہ وہ صرف  
 کوئی ایک ہی احساس پیدا کر سکتی ہے، لہذا ایسی صورت میں ہم اس سے  
 بہتر کوئی ٹھیل یا تمنا نہیں کر سکتے، کہ یہ حرکت اپنے تمام ممکن احساسات  
 میں سے وہی احساس نفس کے اندر پیدا کرے جو انسان کے پوری  
 طرح صحیح و تندرست جسم کے بقا و تحفظ کے لئے سب سے زیادہ  
 موزوں و مفید ہو۔ لیکن تجربہ سے معلوم ہے، کہ فطرت نے جتنے  
 احساسات ہم کو دئے ہیں، جو کچھ وہ سب کے سب ایسے ہی  
 ہیں، لہذا ان میں کوئی ایسی شے نہیں پائی جاتی جو خدا کی قدرت و  
 رحمت پر وال نہ ہو۔

اس طرح مثلاً پیر میں جو اعصاب پھیلے ہوئے ہیں، جب ان کو  
 معمول سے زیادہ شدید حرکت دی جاتی ہے، تو یہ حرکت خفاہ صلب سے  
 گذرتی ہوئی دماغ تک پہنچ کر ذہن میں ایک ایسا ارشام پیدا کرتی ہے، جو  
 پیر میں درد کے احساس کا باعث ہوتا ہے، جس سے ذہن متنبہ ہو  
 جاتا اور اس درد کے سبب کو پیر کے لئے نہایت ہی مضر و خطرناک  
 سمجھ کر اس کے دفع کرنے میں پوری طاقت سے لگ جاتا ہے۔

پہلے یہ کہ خدا انسان کی فطرت کو ایسا بنا سکتا تھا، کہ دماغ کی  
 اچھینچ بھی حرکت پیر کے درد کے بجائے ذہن کو کسی اور چیز کا  
 احساس کراتی، مثلاً اس کو خود اپنی ہی ذات کا احساس یا شعور ہوتا،  
 یا اس طرح کہ وہ دماغ میں ہے، یا پیر میں ہے، یا پیر اور دماغ کے  
 درمیان کسی حصہ میں ہے، یا ان سے بھی مختلف کوئی دوسرا احساس



ہو سکتا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی جسم کی حفاظت و بقا کا  
 ایسا کام نہ دیتا، جیسا کہ وہ احساس جو ذہن کو واقعا اس موقع پر ہوتا  
 علیٰ ہذا جب ہم کو پینے کی احتیاج ہوتی ہے، تو اس احتیاج سے  
 خلق میں ایک خاص قسم کی خشکی پیدا ہو جاتی ہے، جو اس کے اعصاب کو  
 ہرجان میں لاتی ہے، اور اسی ہرجان سے دماغ متاثر ہو کر ذہن کو  
 بیاس محسوس کراتا ہے۔ کیونکہ اس موقع پر ہماری صحت کے بقا کے  
 لئے، اس علم یا احساس سے بڑھ کر کوئی شے نافع نہیں ہوتی، کہ  
 ہم کو پانی پینے کی ضرورت ہے یہی حال دیگر احساسات کا ہے۔  
 لہذا اب یہ پوری طرح روشن ہو جاتا ہے، کہ انسان کی فطرت  
 جو کہ جسم و نفس ہے، اس لئے خدا کی انتہائی رحمت کے  
 باوجود اس سے خارج نہ تھا، کہ بعض اوقات یہ مغالطہ کا باعث  
 ہو جائے۔ کیونکہ اگر کسی سبب سے ہمیں پیدا ہونے کے بجائے  
 پیرے دماغ تک جو عصب گئی ہے، اس کے کسی حصہ یا خود دماغ ہی  
 میں بعینہ وہ ہرجان پیدا ہو جائے، جو معمولاً پیر کی کسی خرابی کے وقت ہوتا  
 ہے، تو قدرۃ آدمی دھوکا کھا جائے گا۔ اس لئے کہ دماغ کے اندر  
 کسی ایک قسم کی حرکت چونکہ ذہن میں کسی ایک ہی قسم کے احساس کا ہوا  
 ہو سکتی ہے، اور یہ احساس چونکہ بہت زیادہ اسی وقت ہوتا ہے  
 جبکہ کسی اور جگہ نہیں بلکہ پیر ہی میں کوئی حرج واقع ہو، لہذا یہ بھی  
 بہت زیادہ معقول بات ہے کہ اس سے ذہن میں کسی اور حصہ  
 جسم کے بجائے ہمیشہ پیر ہی کے درد کا احساس پیدا ہو۔ اور اگر  
 کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے، کہ خلق کی خشکی حسب معمول اس امر کا نتیجہ  
 نہیں ہوتی، کہ صحت جسم کے لئے پانی کی ضرورت ہے، بلکہ کسی اور  
 بالکل ہی مخالف سبب سے پیدا ہو جاتی ہے، جیسا کہ استسقا کے  
 مریضوں میں ہوتا ہے، تو اس خاص صورت میں دھوکا کھا جاتا  
 اس سے بد رہا بہتر ہے، کہ مریض نہ ہونے کی صورت میں بھی

ہمیشہ دھوکا کھاتا رہے۔ و قس علیٰ ہذا۔

میرے نزدیک مذکورہ بالا تحقیق نہایت ہی مفید تھی اس سے نہ صرف ان غلطیوں کا پتہ چل گیا جو ہماری فطرت پر کرتی ہے بلکہ ان سے اجتناب اور ان کی اصلاح بھی زیادہ آسان ہو گئی۔ اس لئے کہ جب ہم نے یہ جان لیا کہ جن چیزوں کا تعلق ہمارے جسم کے نفع و ضرر سے ہے، ان کے متعلق ہمارے تمام حواس غمو یا غلطی کے بجائے صواب رہی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اور ایک ہی چیز کی تحقیق میں قریباً ہم کئی کئی حالتوں سے کام لیتے ہیں، اس کے علاوہ حافظہ کے ذریعہ سے اپنے موجودہ معلومات کو گزشتہ سے ملا سکتے ہیں، نیز ہم سے بھی کام لے سکتے ہیں، جس سے ابھی ہم اپنی غلطیوں کے اسباب معلوم کر چکے ہیں، تو اب مجھ کو ان چیزوں میں غلطی کا خوف نہ کرنا چاہئے، جن کو میرے حواس روزمرہ میرے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور تمام ان شبہات کو مبالغہ آمیز و مضحکہ خیز سمجھ کر دماغ سے نکال دینا چاہئے، جن میں ادھر میں نے اپنے کو مبتلا کر لیا تھا، خصوصاً اس عامۃ الورد و شبہہ کو کہ خواب کو بیداری سے میں الگ نہیں کر سکتا تھا، اس لئے کہ اب ان دونوں میں جھکویہ فرق نہایت نمایاں طور سے نظر آتا ہے، کہ جس طرح ہمارا حافظہ بیدار رہی کی چیزوں کو باہم ایک دوسرے سے ملاتا ہے اسی طرح خواب کی چیزوں کو نہ باہم ایک دوسرے سے ملا سکتا ہے اور نہ ہماری باقی زندگی کی چیزوں سے۔ اور اگر بیداری کی حالت میں کوئی شخص مجھ کو یکایک نظر آئے اور نظر آئے ہی اس طرح غائب ہو جائے گا کہ کچھ پتہ نہ چلے کہ کہاں سے آیا کہھر گیا، جیسا کہ خواب میں ہوتا ہے، تو یہ بچا نہ ہوگا، اگر میں اس کو واقعی آدمی کے بجائے محض اپنے دماغ کا اسی طرح ایک وہم یا آسیب سمجھوں جس طرح کہ خواب کی باتیں سمجھتا ہوں۔ لیکن جب میں ایسی چیزوں کا اور اک

کرتا ہوں، جن کی نسبت صاف طور سے جانتا ہوں، کہ کہاں سے  
 آئیں، کہاں ہیں، اور کس وقت مجھ کو نظر آ رہی ہیں، اور جبکہ ان کے  
 احساس کو میں اپنی باقی زندگی سے ملا سکتا ہوں، تو مجھ کو تمام و کمال  
 اس امر کا یقین ہوتا ہے، کہ انکا ادراک خواب میں نہیں، بلکہ بیدار ہی  
 میں ہو رہا ہے۔ اور اگر میں نے اپنے تمام حواس، حافظہ اور فہم سے  
 ان اور لکات کی اس طرح تحقیق و توثیق کر لی ہے، کہ ایک کی شہادت  
 دوسرے کے منافی نہیں ہے، تو پھر مجھ کو ان کی صحت و صداقت  
 میں ذرہ بھر بھی شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ  
 جب یہ واقعہ ہے، کہ خدا و صو کا نہیں دیتا، تو لازمی نتیجہ ہی نکلتا  
 ہے، کہ میں ان چیزوں سے دھوکا کھا بھی نہیں رہا ہوں۔

لیکن چونکہ بارہا ضرورت وقت اس کی داعی ہوتی  
 ہے، کہ کسی شے کی نسبت فوراً ہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ قبل اسکے کہ  
 اس طرح پوری تحقیق کا موقع ملے، لہذا اعتراضات کرنا چاہئے، کہ  
 انسانی زندگی کو اکثر جزئی چیزوں میں دھوکا ہو جاتا ہے، اور اپنی  
 فطرت کی کمزوری کو تسلیم کرنے پر ہم بہر حال مجبور ہیں۔



# صحت نامہ

## طریق اور تفکرات

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸ (مقدمہ)	۹	آس	اس
۱۲	۱۴	فیا ص	فیا ض
۱۴	۸	پر پڑھتے	پر پڑھنے
۳۱	۱۳	بلا تکلیف	بلا تکلف
۵۳	۲۰	کی	کے
۶۴	۲۱	خدا کو	خدا کے
۹۶	۲۲	یقین	یقینی
۱۳۲	۱۰	سلتا	سکتا
۱۶۴	۳	ہند سے	ہند سے